تذکرہ مجاہد ملت
تصدق حسین بجنوری
مثالی نوجوان
اچھوتا اسلوب
جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم پر
کانگریس کا بخت خفتہ
کی المناک داستان
نقش پائے حق
ہندوستان کی سیہ بختی
جرأت رندانہ
رسم شبیری
دار و رسن
مکتبہ رفیق نصیب پور حسمپورہ منہٹور ضلع بجنور

نام کتاب	تذکرہ مجاہدِ ملت
مصنّف	تصدق حسین بجنوری
کاتب	منور دانش نصیب پوری
باہتمام	مولوی زبیر عالم نجیب آبادی
سنِ اشاعت	شوال المکرم ۱۴۱۶ھ

ملنے کے پتے

کتب خانہ حسینیہ دیوبند (یوپی)

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

مکتبہ طیبہ دیوبند

حفظ الرحمٰن لائبریری طلبا ضلع بجنور

دار العلوم دیوبند

مکینِ خلدِ بریں

حضرات محدثین کے مزارات - قبرستان مہندیان - بیرون دہلی دروازہ دہلی

شاہ ولی اللہ رح

شاہ عبدالرحیم رح

شاہ عبدالقادر رح

مجاہد ملت رح
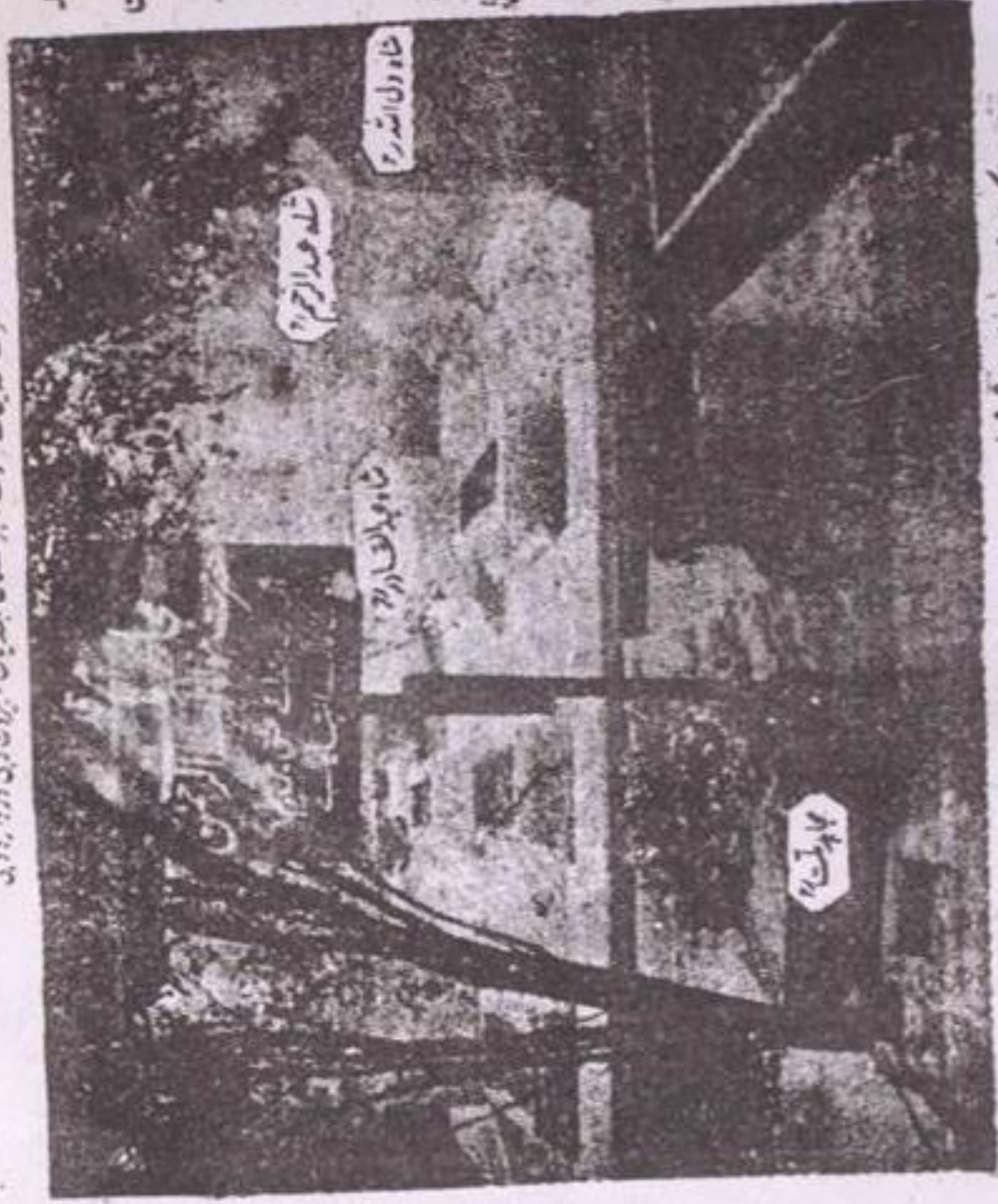
دنیا جانتی ہے کہ مجاہد ملت بیک وقت عالم دین مفسر قرآن، مصنف و خطیب، مدبر و مجاہد، دردمند خادم خلق، پیکر ایثار اور اتحاد قومی کے علمبردار تھے ان اوصاف کو ذہن میں رکھیے! اور مولانا کے مزار کا حدود اربعہ ملاحظہ فرمائیے! اس ہمہ گیر شخصیت کے عناصر ترکیبی خود ہی تصور میں ابھر آئیں گے

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

[illegible] پہ رہبر پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے

وہی مومن ہے جس کو دیکھ کر باطل پکار اُٹھے

کہ اس مرد خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

تفصیلی فہرست

رائے گرامی

جناب حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری

استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً ـــــــ "تذکرۂ مجاہد ملت" دار العلوم دیوبند کے متعلم مولوی تصدق حسین بجنوری سلمہ، کی پہلی قلمی محنت ہے عزیز موصوف نے مسودہ کے اوراق جناب مولانا محمد سلمان صاحب زید مجدھم کی نگاہ سے گذرنے کے بعد کتابت کیلئے دیئے اور اسوقت احقر نے بھی انکو جستہ جستہ دیکھا، الحمد للہ کہ خدمت قابلِ قدر افزائی ہے،

مجاہدِ ملت ایک ایسے تابناک کردار کا نام ہے جسکا حق ادا کرنا تو مشکل ہے لیکن افسوس یہ ہیکہ اس ترقی کے دور میں بھی ایسی کتنی ہی شخصیات ملیں گی جنکا حق اس دور کے اہلِ قلم پر باقی رہ گیا ہے، عزیز موصوف نے اس موضوع کو منتخب کر کے جو کچھ بھی مرتب کیا ہے، وہ موضوع، مرتب، اور حق شناسی کے اعتبار سے ہمت افزائی کے لائق ہے،

دعاء ہیکہ پروردگار عالم، عزیز موصوف کو زیادہ سے زیادہ خدمات کی توفیق عطا فرمائے، اور ہندوستان کے جن علماء و معلمین کا امتِ مسلمہ پر حق باقی رہ گیا ہے نئی نسل کو انکے حقوق ادا کرنے کا سلیقہ، ہمت اور توفیق عطا کرے (آمین)

ریاست علی غفرلہٗ،

خادم تدریس دار العلوم دیوبند،

تقریظ

جناب حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری
استاذ عربی دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دار العلوم دیوبند ایک بہار آفریں چمن کا نام ہے جسکے بے شمار امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی نورانی فضائیں ہر با مقصد علمی اور قلمی کام کیلئے نہایت سازگار ہیں اس "مدینۂ علم" میں خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں، ذہن وفکر کو جلا حاصل ہوتی ہے، کام کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، علم وفن کے "رُخِ زیبا" پر نثار ہونے کے عزائم ظہور پاتے ہیں، اس طرح یہ عظیم ادارہ آج بھی اُفراد سازی کا سب سے کامیاب مرکز ہے،

اسی مرکز علم وعمل کے ایک زیرِ تربیت فرزند مولوی تصدق حسین بجنوری سلمہ اللہ کی محنت کا ثمرہ آپکے سامنے ہے جنھوں نے اپنی پہلی قلمی کاوش کے موضوع کی حیثیت سے مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا ہے،

مجاہدِ ملت دار العلوم کے اس عظیم سپوت کا نام ہے جو صرف خطۂ بجنور کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کیلئے سرمایۂ فخر وناز ہے انکی مجاہدانہ سرگرمیاں، آزادیٔ ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں انکی ملک وملت کیلئے

وقف زندگی نے اپنی شکستہ دل قوم کو بڑا سہارا دیا ہے، انکی صرف ۶۲ سالہ مختصر حیات نے نہ جانے کتنوں کو جینے کا حوصلہ دیا ہے، انکی جرأت وشجاعت کی داستانیں حکومتِ ہند کے ایوانوں میں اور ہندوستان کی ایک پوری نسل کے دل پر ثبت ہیں،

ع چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

مجاہدِ ملت کے اس مقامِ بلند کے باوجود اس بکھری ہوئی داستان کو یکجا کرنے کا ضروری کام کم ہی انجام دیا گیا ہے الجمعیۃ کے "مجاہد ملت نمبر" اور دیگر اخبارات ورسائل کے ایک دو خصوصی نمبروں کے علاوہ اس عظیم شخصیت پر مواد بہت مشکل سے ملتا ہے، اس مشکل کا احساس مرتب عزیز کو اس وقت ہوا جب انھوں نے طلبہ بجنور کی انجمن تہذیب الاخلاق کے زیرِ اہتمام "مجاہدِ ملت کی حیات وخدمات" کے عنوان پر ایک تحریری مسابقہ میں حصہ لیا (جس میں ماشاء اللہ ان کے مقالہ کو پہلا انعام حاصل ہوا) اس احساس نے انکے دل میں اس موضوع پر کام کرنے کا داعیہ پیدا کیا، ان کے احباب کی تائید نے اس داعیہ کو تقویت بخشی، جس کے بعد انھوں نے اس موضوع پر منتشر مواد یکجا کر کے مرتب کرنا شروع کیا اب ان کی محنت نے "تذکرۂ مجاہدِ ملت" کے نام سے اس موضوع پر ایک کتاب کا اضافہ کر دیا ہے،

احقر نے مرتب کی فرمائش پر اس تحریر کو پڑھا ہے، جا بجا کچھ مشورے بھی دیئے ہیں جو انھوں نے عموماً قبول کئے، ماشاء اللہ یہ محنت لائق تحسین او مستحق ہمت افزائی ہے مواد کافی جد وجہد سے جمع کیا گیا ہے، ترتیب بھی بہتر ہے، زبان بھی اچھی ہے جو طالبِ علمانہ معیار کے

پیشِ نظر یقیناً حوصلہ افزائی کے لائق سمجھی جائے گی، مولوی تصدق حسین کا یہ نقشِ اول ان کے بہتر مستقبل کا غماز ہے، اللہ تعالیٰ ان کو مزید زورِ قلم عطا کرے، ان کی صلاحیتوں کو دینِ متین کی خدمت کیلئے قبول فرمائے اور ان کی اس کاوش کو قبول عام عطا کرے (آمین)

وَالسَّلامُ

محمد سلمان عفا اللہ عنہ
۲۹ رجب ۱۴۱۶ھ

۱۰؍ اکتوبر ۱۹۹۵ء مطابق ۲۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ کو انجمن تہذیب الاخلاق طلبار ضلع بجنور کی جانب سے ایک تحریری انعامی مقابلہ بعنوان مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ؒ منعقد ہوا جس میں احقر نے بھی شرکت کی، مولانا پر مواد اتنا منتشر تھا کہ اسے جمع کرنا جوئے شیر لانے کے مرادف تھا چنانچہ اسی مقصد کی تکمیل کیلئے دہلی کا سفر کیا اور مواد اکٹھا کرنے میں کافی حد تک کامیابی ہوئی خود حضرت مولانا کے دولت کدہ پر بھی حاضری کی سعادت سے نصیب ہوئی مگر سوئے قسمت کہ مولانا کے صاحبزدے جناب اسلم صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی، اسکے علاوہ بھی کئی جگہ سے معلومات فراہم کیں، مقالہ لکھنا شروع کیا تو قلم روانی کے ساتھ آگے بڑھتا گیا تاآں کہ مضمون مقابلہ میں طے شدہ مقدار سے کہیں زیادہ طویل ہوگیا اسلئے بادِل ناخواستہ قطع وبرید کے مقابلہ میں پیش کیا جس میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی بعد ازاں

میرے بعض مخلص دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے اسلئے کہ مولانا کی ذات ستودہ صفات پر اب تک کوئی مستقل کتاب دستیاب نہیں ہے احقر نے اپنی سعادت سمجھ کر ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مزید مواد جمع کر کے اشاعت کی نیت سے مرتب کرنا شروع کر دیا کیوں کہ بزرگانِ دین کی سوانح عمری رجال سازی میں انتہائی مفید اور موثر ہوتی ہیں اسلئے ہر دور کے مصنفین و مؤلفین نے بزرگان سلف کے متفرق واقعات و مکمل سوانح حیات یکجا کر کے امت کے لئے اس متاعِ گراں کو بطور ریکارڈ محفوظ کیا ہے،

دورِ آخر میں اللہ رب العزت نے علماء دیوبند کو یہ امتیازی شان عطا فرمائی کہ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر، سیرت و کردار کے ذریعہ عہدِ صحابہ و تابعین کی یادیں تازہ کیں، اور ہر میدان میں اپنی عبقریت کی دھوم مچا دی، مدرسہ کی چہار دیواری سے لے کر سیاست کی پرخار وادی تک اپنا اثر و رسوخ ثبت کر دیا، اس دوش ہستی پہ جن حضرات کے دیرپا احسانات ہیں ان میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ایک مکمل اور جامع کتاب ہیں مجھے یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ میں خورد سال اور ہیچ مداں طالبِ علم ایک قد آور شخصیت کی خوبیوں اور کمالات پر رقمطرازی کی جرأت کر سکوں گا ——— لیکن،

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پیش نظر رہے کہ ہر تحریر کو مختلف عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے تحت مجاہدِ ملتؒ کی زندگی کے متعلقہ واقعات پیش کئے گئے ہیں

یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ مولانا کی پوری زندگی کو ان چند سطور میں بیان کر دیا گیا ہے بلکہ عرق ریزی وجاں سوزی کے بعد جو کچھ لکھ سکا ہوں وہ نذر قارئین ہے،

آخر میں اپنے ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا فرض عین سمجھتا ہوں جن کے مشوروں اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس کام میں ہمیز کیا مگر الفاظ کا دامن اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگی کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے، خاص طور سے جناب حضرت مولانا **محمد سلمان** صاحب بجنوری جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس ناچیز کی ہمت افزائی فرمائی، اور (مولوی) **زبیر عالم** نجیب آبادی جنھوں نے اس مبارک کام کیلئے میری راہ نمائی کی اور کاتب **منور دانش** نصیب پوری جنھوں نے اس بحر بے کنار کو عبور کرنا میرے لئے سہل فرمایا و دیگر مخلصین احباب کا تہ دل سے شکر گذار ہوں ــــــ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ناچیز کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہمیں ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے نیز مسلمانوں کیلئے نافع اور مفید بنائے (آمین)

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

احقر

تصدق حسین نصیب پوری (ضلع بجنور)

متعلم دار العلوم دیوبند شریک سال پنجم

شب جمعہ ۲۱ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افقِ ہند پر علم و عرفاں کے بہت سے درخشندہ و تابندہ ستارے نمودار ہوتے جنکے علمی تبحر، سیاسی تدبر اور خداداد صلاحیتوں کا لوہا اپنوں ہی نے نہیں بلکہ غیروں نے بھی مانا ہے جن کی سحر بیانی و جادو کلامی کو دیکھ کر بامِ عرش کے طائر ہمنوا بن گئے جنکے عزم جواں کے آگے سامراجی طاقتوں کے قدم متزلزل ہو گئے، ان میں وہ آفتاب فضل و کمال بھی ہے جسکی ضیا پاشی وضو باری سے عالمِ اسلام نصف صدی کے قریب منور رہا جسکی حسنِ تدبیر اور بصیرت نے علم و سیاست کی الجھی ہوئی گتھیوں کو بیک جنبش حل کر دیا،

زمانے نے آپکے مجاہدانہ کارناموں اور بے لوث خدمات کو دیکھتے ہوئے "مجاہدِ ملت" جیسے عظیم خطاب سے نوازا آپکی ذات ستودہ صفات پر یہ خطاب بالکل چسپاں ہوتا ہے یہ کہا جائے تو عین حقیقت بیانی ہوگی کہ مولانا اس لقب سے جڑ کر نہیں بلکہ خود یہ لقب مولانا کی ذات سے مل کر بالکل اس طرح روشن ہو گیا،

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اسکا مقام اور ہے اسکا نظام اور ہے

اس مجموعۂ کمالات انسان کو جو بزم یاراں میں ریشم کی طرح نرم، رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد کی طرح گرم گویا خاکی تھا مگر خاک سے آزاد آج دنیا مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتی ہے

یقیناً مولانا کی شخصیت اقلیم علم و کمال کی تاجدار، میدانِ سیاست کی شہسوار، زمانے کی طبیعت کی نبض شناس نباض، بحر شریعت و طریقت کی کامیاب غواص کاروانِ حریت کی سالار کارواں تھی،

ے در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

مولانا کی حیات مبارکہ میں سب سے اہم ترین اور جاذب نظران کی قومی و ملی خدمات کا پہلو ہے، دراصل مولانا نے جس وقت اس کارگہہ شیشہ گری میں قدم رکھا وہ ہندوستانی تاریخ کا تاریک ترین دور کہلاتا ہے جسکو شاعرِ مشرق نے "سکوت آموز طویل داستان درد" کے نام سے تعبیر کیا ہے ایسے پر آشوب دور میں کسی ایسے مسیحا کی ضرورت تھی جو یتیم ہندوستانیوں کے سروں پر دستِ شفقت رکھے اور اس فریب خوردہ شاہیں کو رسم رفتہ یاد دلائے، نوجوانان ہند کے سینوں میں عقابی روح بیدار کرے تاکہ انکو اپنی منزل آسمانوں پر نظر آئے اور ان سے کہے،

ے نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

سچ ہے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ رونے کے بعد ہی بزم عشق سے دانائے راز پیدا ہوتا ہے،

ے عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

علم وسیاست کا یہ علم بردار ۱۰؍جنوری ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ کو ضلع بجنور کے قصبہ سیوہارہ محلہ مولویان میں ایک معزز تعلیم یافتہ زمیں دار صدیقی گھرانے میں پیدا ہوا، اسم گرامی معز الدین کنیت ابو القاسم اور تاریخی نام حفظ الرحمن تھا، آج اصل نام کے بالمقابل تاریخی نام سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں، جب دنیائے فانی میں آنکھیں کھولیں تو خلافتِ اسلامیہ کا قلعہ زمیں بوس اور اتحاد اسلام کا پاکیزہ تصور پارہ پارہ ہو رہا تھا حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ ایک طرف علامہ شبلی نعمانی مرثیہ خواں تھے،

؎ حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

اور دوسری جانب علامہ اقبال مرحوم دلگیر ہو کر پکار رہے تھے،

ع خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور ؎ چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

گھرانہ

والد ماجد الحاج مولوی شمس الدین ایک شب زندہ دار علماء حق سے عقیدت رکھنے والے سیدھے سچے مسلمان تھے، راہِ طریقت میں اس وقت کے بلند پایہ بزرگ قطبِ دوراں شاہ فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی کے مرید باصفا تھے، ریاستِ بھوپال اور بیکانیر میں اسسٹنٹ انجینیر کے عہدے پر فائز رہے، مولوی شمس الدین کے چھ۶ اولاد ہوئیں چار لڑکے مولوی ڈپٹی فخر الدین، مولوی بدر الدین وکیل، مولانا حفظ الرحمٰن، اور حکیم صلاح الدین، اور دو۲ لڑکیاں بتول فاطمہ، عظمت النساء، بڑی لڑکی کا عقد مولوی انوار الحسن صاحب نائب صوبہ دار گولیار سے ہوا، اور دوسری لڑکی حافظ ابراہیم وزیر آب پاشی کے عقد میں آئیں،

والدہ محترمہ پابندِ شریعت اور نیک سیرت خاتون تھیں انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا حفظ الرحمٰن کو مجاہدِ ملت کے لقب سے پکارتی ہے

تعلیمی دور

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی درسِ نظامی کی اکثر کتابیں وطنِ مالوف قصبہ سیوہارہ کے مدرسہ فیضِ عام میں مولانا سیّد عبد الغفور سیوہاروی تلمیذ رشید حضرت مولانا سیّد احمد حسن صاحب امروہوی، مولانا آفتاب علی شاگردِ خاص مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، اور الحاج حافظ احمد حسن صاحب وغیرھم وقت کے مشہور و معروف اساتذہ سے پڑھیں، جن کے محاسن و کمالات مولانا پر بھی اثر انداز ہوئے،

عہدِ طفولیت

مولیٰنا بچپن سے سیدھے سادے اور نیک طبیعت انسان تھے چھٹی کے بعد فوراً گھر چلے آتے راستے میں کسی سے ہنسی مذاق کرنا پسند نہ کرتے اور نہ ہی دوسرے بچوں کی طرح لہو و لعب میں مشغول ہوتے اگر کوئی بوڑھا شخص راستے میں مل جاتا تو اسے انتہائی ادب سے سلام کرتے

۱۳۳۳ھ میں چمنستان شاہی سے ملحق ہوکر درسِ نظامی کی مشہو کتابیں شرح جامی نور الانوار وغیرہ کا درس دیگر اساتذہ کے ساتھ ساتھ محدث جلیل محقق و مدقق حضرت مولانا فخر الدین صاحب قدس سرہ شیخ الحدیث قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد ثم دار العلوم دیوبند سے حاصل کیا، جب اعلیٰ تعلیم کا دور شروع ہوا تو ہفتہ واری پروگرام میں تقریر کیلئے اسلام وغیرہ سے متعلق اہم موضوع منتخب کرکے دیئے جاتے اور مولانا بلا ناغہ اس مجلس میں شریک ہوکر اساتذہ سے دادِ تحسین حاصل کرتے،

۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں فیض عام سیلو بارہ سے دورۂ حدیث سے فراغت کی اور مزید تشنگیٔ علم دور کرنے کیلئے مرکز علم و فضل دار العلوم کیلئے رختِ سفر باندھا جہاں پر خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری کے سحابِ علم و کمال کی موسلا دھار بارش ہورہی تھی، جس سے آپ نے خوب سیرابی حاصل کی اور اپنی بلند پایہ ذکاوت و ذہانت کے باعث جلد ہی اساتذہ کا مرکز توجہ بن گئے

۱۳۴۲ھ میں دوبارہ دار العلوم سے سندِ فراغت حاصل کی، علامہ کشمیری کا دربار وہ تھا کہ فراست و ہوشمندی کو وہاں دامن سنبھال کر بیٹھنا پڑتا تھا

اور علم وفضل چوکنّے ہوکر آتے شرمندہ ہوکر جاتے تھے ایسے دربار میں مقام حاصل کرنا غیر معمولی کام تھا علامہ کے سبق میں بہت کم طلبہ بولنے کی جرءت کرتے اور بولنے سے پہلے اپنی بات کو ناپ تول لیتے تھے مگر سنا ہے کہ مولانا حفظ الرحمن کی ذکاوت وذہانت کے پیشِ نظر حضرت علامہ نے اس شرف سے نواز اتھا کہ خود دریافت فرماتے حفظ الرحمن تمہیں کچھ معلوم کرنا ہے،

دوسرا شرف یہ بخشا کہ حضرت علامہ رات کو جس حجرے میں مطالعہ فرماتے تھے اسکے وسط میں ایک پردہ ڈال کر مولانا کو جگہ عطا فرمائی، ایسا قرب شاگرد تو شاگرد کسی مدرس کو بھی نہیں بخشا تھا، اور پورے ایک سال تک گلستانِ کشمیری کی خوشہ چینی کے علاوہ علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی اعظم مفتی عزیز الرحمن عثمانی، قطبِ عالم مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندی جیسے اکابرِ ملت سے استفادہ کیا جن کی کیمیا اثر نگاہوں نے آپ کو عروج وترقی کی شاہ راہ پر گامزن کردیا،

مثالی نوجوان

انسان جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو رنگین خیال وتصورات میں غرق، شریک ہم سفر کی جستجو میں محوِ خواب، اور جام وسبو کی محفلیں سنوارتا نظر آتا ہے لیکن اس مردِ مجاہد کی جوانی پر نظر ڈالئے غالباً ۱۹۱۹ء میں سنہس پور میوانوادہ ریلوے اسٹیشن پر دون ایکسپریس کا خوفناک حادثہ پیش آیا حادثہ اتنا شدید تھا کہ قرب وجوار کے دیہاتی باشندے دوڑ پڑے مولانا کو جب اسکی خبر ملی تو بے قرار ہو اٹھے اور پانچ میل کا پیادہ سفر کرکے جائے واردات پر پہنچے اس بھیانک اور دلسوز منظر کو دیکھ کر بے اختیار رو پڑے پھر جس مستعدی کے ساتھ زخمیوں اور ضرب رسیدہ مرد عورت بچّوں کو کمر پر لاد لاد کر ہسپتال پہونچایا اور دو پورے ایک دن ایک رات بھوکے پیاسے ان زخمیوں کی دست گیری وخبرگیری میں مصروف

رہے ، اسکو نہ الفاظ کا پیرہن پہنایا جاسکتا ہے نہ تحریر کی لڑی میں پرویا
جاسکتا ہے ،

جن لوگوں نے ریلوے حادثات دیکھے ہیں وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ
زخمیوں کی کراہٹیں اور ملبے میں دبے ہوؤں کی چیخیں کتنی دل خراش ہوتی ہیں
لیکن مولانا پر نہ خوف و ہراس تھا نہ زخمیوں کے خون سے لتھڑے ہوئے جسم سے
گھن ، بس بے پایاں مدد تھی ،

جذامی کا جنازہ

آپ کے زمانہ طالبِ علمی کا واقعہ ہے مادرِ وطن
سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی کی ناگفتہ بہ حالت میں
وفات ہوگئی کوئی اسکو غسل دینے کیلئے آمادہ نہیں
ہوا تو مولانا نے اپنے دستِ شفقت سے غسل دیا اور تجہیز و تکفین کا سارا کام
خود انجام دیا ،

یہ داستان اس انسان کی ہے جو آگے چل کر مجاہدِ ملت جیسے عظیم الشان
لقب سے ملقب ہوا ، سچ ہے دلہن کے پیر ڈولی میں ہی نظر آجاتے ہیں
یہ مثل مولانا کی زندگی پر حرف بحرف چسپاں ہوتی ہے ان کے دل میں
شروع ہی سے قوم و ملت کی خاطر مرمٹنے کا جذبہ بیدار تھا ،

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

باکمالِ معلّم

مادرِ علمی دار العلوم دیوبند سے دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد اکابر نے آپکی پوشیدہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے سیٹھ یعقوب صاحب کی درخواست پر بغرض تدریس مدراس بھیج دیا جہاں پر انھوں نے اپنی انتھک محنت اور قابلیت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر اس طرح جمایا کہ آخری عمر تک وہاں کے لوگ مدح سرا رہے، قیامِ مدراس ہی کے زمانے میں مولانا نے ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں حجاز مقدّس کا سفر کیا اور حج و زیارت کے اہم فریضے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے،

حج سے واپسی کے بعد حضرات اساتذہ کے حکم سے مادرِ علمی میں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کر دیں لیکن انسان کی خواہش اور اسکا سوچا کب پورا ہوتا ہے،

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ
تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

آدمی اپنی ہر خواہش کی تکمیل سے بہرہ مند نہیں ہوتا (بسا اوقات) ہوائیں کشتیوں کی مخالف سمت میں چلتی ہیں،،

ایسا ہی کچھ مولانا کی زندگی میں اس وقت ہوا جبکہ علامہ انور شاہ کشمیری نے باہمی ناچاقی کی بنا پر دار العلوم چھوڑ کر ڈابھیل جانے کا عزم کیا، مولانا جو حضرت علامہ کے خصوصی شاگرد تھے بادلِ ناخواستہ انکے ہمراہ ہو لیئے دیوبند سے چلے جانے کے بعد تقریبًا پانچ سال ڈابھیل ضلع سورت علاقہ بمبئی (اب گجرات) میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے مولانا کی زندگی کے یہ پانچ سال بظاہر پرسکون نظر آتے صرف تعلیمی تدریسی مشاغل مگر باطن پر شور ہر وقت ملک کی تباہ حالی کا رنج قوم کی بربادی کا غم اور مستقبل کی تعمیر کا جنوں سوار رہتا اسی سلسلے میں اواخر ۱۹۲۱ء میں میرٹھ کی جیل میں قید کر دیا گیا،

جامعہ ڈابھیل میں حدیث و تفسیر کی اعلٰے کتابیں انکے زیرِ درس تھیں جنکو آپ خاص شغف و محنت سے پڑھاتے تھے، جس سے نہ صرف عام پبلک بلکہ اہلِ علم طبقہ پر بھی مولانا کا اثر و رسوخ بے حد بڑھ گیا تھا مگر آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے وہاں سے تشریف لے آئے،

استاذِ محترم حافظ احمد حسن صاحب کے حکم پر مدرسہ فیضِ عام سیوہارہ میں جہاں پر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے تھے استاد کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوئے اور تلخیص المفتاح و مقامات حریری کا درس دیا،

اس وقت کے شاگردوں میں مولانا شرافت علی صاحب سیوہاروی کا نام سرِ فہرست ہے جو بقید حیات مدرسہ امداد العلوم محلہ مغلوشاہ نجیب آباد میں طویل عرصہ سے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں،

سیاسی قائد ہونے کی حیثیت سے تو کوئی انکا ہم پلہ تھا ہی نہیں درس و تدریس میں بھی انکو ایک خاص مقام حاصل تھا، اپنی بات طلبہ کو بہتر سے بہتر طریقے سے سمجھانے اور مغلق سے مغلق عبارت کو واضح کرنے کا جو ملکہ بارگاہِ ایزدی سے انکو عطا کیا گیا تھا وہ بہت کم نصیب ہوتا ہے،

یہی مولانا شرافت علی بیان فرماتے ہیں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہمیں مقامات حریری اور تلخیص المفتاح کا سبق بیک وقت پڑھایا اور ایسا گھول کے پلایا کہ آج تک وہ اندازِ گفتگو دلبرانہ طرزِ ادا، ہاتھوں کے واضح اشارے، مشکل و مغلق الفاظ کی مکمل تشریح دماغ میں محفوظ ہے، مولانا نے اسی ملکہ کے سبب جوانوں میں عقابی روح بیدار کی اور انکے طرزِ فکر خیالات و تصورات کو ایمانی دولت سے سنوارا، انکے فیضان سے نہ جانے کیسے کیسے عزائم بیدار ہوئے اور کتنے ولولے دلوں میں تڑپنے لگے لیکن مولانا کی ذات سیوہارہ کی تنگنائیوں

میں محصور ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوئی تھی بھلا کس طرح ان کی عالم گیر شخصیت ورفعت پسند طبیعت ارضِ وطن کی خاک پر قناعت کرسکتی تھی،

مفسر "قرآن"

چناں چہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر کلکتہ تشریف لے گئے (اس انجمن کے بانی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ ہیں)

کلکتہ میں تبلیغی خدمت، درسِ قرآنِ کریم خاص مشغلہ تھا، ہر روز صبح کو دفترِ تبلیغ سراج بلڈنگ اور شام کو مسجدِ جمال الدین مرحوم میں قرآن کی تفسیر بیان فرماتے اور مطالب ومعارفِ قرآنی کو نہایت مہذب انداز میں الفاظ کا جامہ پہناتے، گو تکالیفِ شدیدہ کے باعث کلکتہ کو خیرآباد کہنا پڑا لیکن صرف ڈھائی سال کے مختصر عرصہ میں وہاں کے باشندوں کے دلوں کو اس طرح موہ لیا کہ جس کے نقوش ہزارہا حوادثات کے پیش آنے کے باوجود تادمِ حیات نہ مٹ سکے،

بعد ازاں چند دن امروہہ میں قیام رہا امروہہ میں جامعہ اسلامیہ جامع مسجد اور چلہ، کی نگرانی واہتمام کی خدمات بحسن وخوبی انجام دیں،

مولانا کی بے شمار خوبیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ جہاں بھی جاتے لوگ انکے گرویدہ ہوجاتے ربِ کائنات نے ہر دل عزیزی کی جو سند مولانا کو عطا کی تھی وہ شاذ ونادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے،

علمی مقام

مولانا مرحوم ہمارے سامنے ایک تاریخ ساز کردار کی حیثیت سے ابھر کر آتے ہیں، انکی شخصیت سوسائٹی میں رونما ہونے والے حالات، غیر محسوس تاریخی اثرات اور کچھ خداداد صلاحیتوں کا نمونہ تھی وہ جہدِ مسلسل اور سعی پیہم کی ایک چلتی پھرتی تصویر، اور ٹھوس عزائم ویقینِ محکم کا مجسمہ تھی

جن حالات میں انھوں نے اپنے نصب العین کی تکمیل کی وہ بجائے خود بہت صبر آزما ماحول تھا ان کا عہدِ شباب دیوبند جیسی عظیم درسگاہ میں گذرا اس کے علماء وصلحاء کی صحبت نے ان کے عظیم نصب العین کی تکمیل میں ایک اچھا کردار ادا کیا اور ان کی کیمیا اثر نگاہوں نے ان کو عوام کے دائرے سے نکال کر عالمی شخصیت کا حامل بنا دیا، علامہ کشمیری صرف ایک بڑے عالم دین ہی نہ تھے بلکہ خود ایک مکتبِ خیال وفکر تھے جن کے فیضانِ صحبت نے اور چار چاند لگا دیئے،

دارالعلوم کے بانیوں کی نظر میں سب سے اہم کام ظالم انگریز سے اپنی قوم وملت کو جسمانی وروحانی دونوں اعتبار سے آزاد کرانا تھا، اسی مادرِ علمی کے ہونہار فرزندوں نے بڑھتی ہوئی عیسائیت کا پوری قوت سے مقابلہ کیا، آخر کار انگریز نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا جو خیال بعد میں ترک کیا اسکی اصل بنیاد تحریک دارالعلوم ہے،

اس طرف سے مطمئن ہوکر اکابر نے جارحانہ کارروائی کے متعلق سوچنا شروع کیا، شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اسکی زندہ مثال ہے ایک اسلامی یونیورسٹی کا سربراہ کس طرح اپنے وقت کی ظالم قوم سے ٹکر لینے کی کوشش کرتا ہے آنے والا مؤرخ اس عظیم سربراہ کے عزائم کو ضرور خراجِ تحسین پیش کرے گا،

ایک طرف انگریز سے مقابلہ کا یہ سخت مادی رخ تھا تو دوسری جانب مغربی خیالات ونظریات پر تنقید وتجزیہ، حالانکہ مؤخر الذکر کی ابتدا انیس ویں صدی کے آغاز سے ہو چکی تھی مگر اس کو صحیح پوزیشن پر لانا بھی حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ نیزان کے تلامذہ کا کارنامہ ہے اس سلسلے میں انکے

شاگردوں کی خدمات تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے،
یہ تھے وہ تمام حالات جن کو نظرانداز کر کے مولانا کے علمی مقام کی تعیین نہ صرف مشکل بلکہ محال کے مترادف ہے مولانا کے کردار کی تشکیل اسی دور میں ہوئی اتفاقاً اسی دوران انگریزی سامراج کے خلاف عام بیداری کی وہ چنگاری جو ظلم واستبداد کی چٹان تلے دب چکی تھی دوبارہ جوالہ مکھی بن کر پھٹ پڑی، چنانچہ مولانا کو اپنی شخصیت دو حصّوں میں تقسیم کرنی پڑی۔ اگر ان کو اللہ نے ذہنی صلاحیت اور ٹھوس استعداد عطا کی تھی تو دوسری طرف قلمِ ازل نے سیاسی رہ نمائی کا فرض انکے حصّہ میں لکھدیا تھا،
بیسویں صدی کے اکثر مفکّرین ان حالات سے دوچار تھے انکو اپنی ذہنی کاوشوں کو دو طرف بانٹ نا پڑا، محمد علی جوہرؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، علاّمہ اقبالؒ، حضرت مدنی رحؒ، وغیرہ کے ساتھ بھی یہی المیہ پیش آیا، بلاشبہ مولانا مرحوم اپنی علمی لیاقت، تحقیق وجستجو کی بنیاد پر اپنے وقت کے علمی امام شمار کئے جاتے چونکہ انکی تالیفات میں سیاسی زندگی کا پرتو نظر نہیں آتا اسکے برعکس مولانا آزاد کی تصانیف میں سیاسی سرگرمیاں ملتی ہیں علامہ اقبال نے شاعری کے ذریعہ اپنی اعلیٰ صلاحیت اور فکربندی کی راہ ڈھونڈ لی مگر مولانا کو تمام عمر یکسو ہو کر علمی کام کرنے کا وقت ہاتھ نہ آیا اور سیاسی مصروفیات کی بنا پر وہ اپنی تسکین کی کوئی راہ نہ پا سکے، بقول پروفیسر عفران احمد یہ بات انکی تعریف میں ہی کہی جا سکتی ہے ایک فرض پسند انسان کی حیثیت سے انھوں نے اپنے ذاتی رجحانات کو خیرباد کہہ کر سیاسی دعوت کو قبول کر لیا، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو خداوند قدّوس نے اعلیٰ علمی صلاحیتوں کا پیکر بنایا تھا اگر انکو یکسو ہو کر علمی تحقیق وجستجو کا وقت

ملتا تو وہ یقیناً اس میدان میں اپنی انفرادیت منوا لیتے مگر سیاسی میدان میں اتر کر وہ مجاہدِ ملت ضرور کہلائے لیکن اس بلند علمی مسند پر نظر نہ آسکے جسکے کہ وہ بجا طور پر مستحق تھے،

تصنیفی زندگی

قیامِ مدراس کے دوران موصوف کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ابتداءً آپکے نوک خامہ سے جو کتابیں صفحۂ قرطاس پر وجود میں آئیں انکی روانی وسلاست کو دیکھ کر ادب سے ذرا بھی تعلق رکھنے والا انسان یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ مولانا کو خدا نے جہاں اور بہت سے اوصاف سے نوازا تھا وہیں ان میں تصنیفی وصف اپنی انفرادیت پر آپ گویا ہے،

اس دوران مولانا نے دو کتابیں "حفظ الرحمن لمذہب النعمان" اور "مالا بار میں اسلام" تصنیف فرمائیں مولانا کے قلم نے علم وسیاست شریعت وطریقت، تاریخ وادب ہر موضوع پر جولانی دکھائی آپکا قلم سیرتِ پاک جیسی اہم اور نازک ترین وادیوں سے گذرا مگر کہیں اسکے قدم متزلزل نہیں ہوئے، سیرت سے متعلق آپ نے "البلاغ المبین فی سید المرسلین" "نور البصر فی سیرۃ خیر البشر" جیسی کتابیں تصنیف فرمائیں علاوہ ازیں ملک وملت کے پیش آمدہ مصائب اور ان کے درمیان رونما ہونے والی تخریبی سرگرمیوں کے سدِّ باب کے سلسلے میں، بہت سی کتابیں تحریر فرمائیں طبقۂ علماء کے لئے ایک تصنیفی پلیٹ فارم مہیا کرنے اور مسلمانوں کے ذہنی جمود کو دور کرنے کیلئے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں دہلی میں ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی جسکے تحت آپ نے نہ صرف اچھی کتابیں تصنیف کیں بلکہ بہت سے اچھے لکھنے والوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا

ے کتنوں کو تو نے بنایا طوطئ ہندوستان
ملک میں پیدا کئے قلم کے پاسبان

اب وہ الزام نہیں

فضلائے دارالعلوم کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ درس و تدریس، وعظ و تقریر کر ہی مردِ میدان ہیں، تحریر میں انکا کوئی خاص مقام نہیں ہے، یہ گمان اس لحاظ سے تو ایک حد تک درست تھا کہ اکابرِ دیوبند کی نگرانی میں اب تک کوئی اسطرح کا ادارہ قائم نہیں ہوا تھا، لیکن یہ نکتہ چینی کہ فضلائے دارالعلوم میدانِ تصنیف و تالیف میں تہی دست ہیں بالکل غلط، سراسر بہتان تھا اس لئے کہ انکا صرف تصنیفی تالیفی کام بڑے بڑے اداروں کے کام پر بھاری ہے، ۱۹۳۸ء میں بہرحال ندوۃ المصنفین قائم ہوا اور فضلائے دارالعلوم کا دامن اس بدنامی سے ہمیشہ کے لئے پاک ہوگیا اس سلسلے میں مجاہدِ ملت نے ہی بنیادی کوشش کی تھیں اور وہ ہی اس کے رفیقِ اعلیٰ منتخب ہوئے

اس کے تحت حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے اندازِ فکر و نظرپر وقت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے احکام اسلام کو فروغ بخشا مگر بدقسمتی کہ آپکا محبوب تصنیفی مشغلہ عرصہ دراز تک قائم نہ رہ سکا اور ۱۹۴۷ء کے سیلاب کی وجہ سے بند ہوگیا اس دوران مولانا کو یکسو ہوکر دوسرے مصنفین کی طرح کبھی موقع میسر نہ ہوا اگر اس طرح کا موقع ان کے ہاتھ آتا تو خدا جانے اس میدان میں آپ کا کیا مقام ہوتا، لیکن ان سب کے باوجود ہم آپ کے قلمِ خلّاق کی روانی کو کسی بھی بڑے سے بڑے مصنف کے سامنے بلا تامل پیش کر سکتے ہیں،

قصص القرآن

آپ کی تصانیف میں قصص القرآن مجلد چار جلدیں ۱۷۸۴ صفحات پر مشتمل ایک ایسی معرکتہ الارار اور بصیرت افروز تحقیقی تصنیف ہے جس کو علمی دنیا میں دائمی شہرت حاصل ہے جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب کسی ایسے محقق اور صاحبِ علم و بصیرت کی تصنیف ہے جسے قرآنی علوم اور تفاسیر پر پورا عبور حاصل تھا قرآنی واقعات و آثار پر اسکی گہری نظر تھی قصص القرآن کی تقسیم اس طریقے پر ہے،

جلد اوّل

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے عبورِ بحرِ قلزم تک تمام انبیار اکرام کے حالات و واقعات بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں خاص طور پر حضرت نوح حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہم السلام کے واقعات پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں،

جلد دوم

میں یوشع علیہ السلام سے حضرت یحییٰ تک تمام پیغمبروں کی سوانح عمری اور دعوتِ حق کی محققانہ تشریح نہایت تعمق سے پیش کی گئی ہے،

جلد سوم

اس جلد میں بعض انبیار کے حالاتِ زندگی کے علاوہ اصحاب کہف، اصحابِ رقیم، سیلِ عرم اصحابِ فیل، اصحاب السبت، بیت المقدس اور یہود نیز ذوالقرنین وغیرہ کی بحث خاص

طور پر قابلِ ملاحظہ ہے اس میں دلچسپ تحقیق ذو القرنین اور سدِّ سکندری کی ہے اور یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ قرآن میں مذکورہ ذو القرنین سکندر یونانی نہیں ہے بلکہ زمانۂ ماضی بعید میں ایک عدل پسند مؤمن بادشاہ گذرا ہے

جلدِ چہارم

از عیسیٰ علیہ السّلام تا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تمام واقعات کا تذکرہ ہے حضرت عیسیٰؑ سے متعلق خاص بحثیں رفعِ سماء، ولادت، حیات اور قادیانی دعوؤں کی تردید بڑی قوّت کے ساتھ کی گئی ہے اور نبی آخر الزّماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کی مقدس سیرت کو قرآنِ کریم کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، واقعہ معراج او غزواتِ نبوی کو خاصی دل چسپی و عرق ریزی سے بیان کیا ہے،

اس کتاب نے مولانا کو علمی دنیا میں ایک خاص مقام عطا کیا ہے سچ تو یہ ہے کہ اگر مولانا کی صرف ایک ہی کتاب ہوتی تو انکی دائمی شہرت میں کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اسکے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی، آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا اسلام کا اقتصادی نظام، اخلاق و فلسفۂ اخلاق اور تحدہ قومیت وغیرہ اس بات کی بیّن دلیل ہیں، مناسب ہے کہ قصص القرآن کے علاوہ دیگر تصانیف پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لی جائے،

اسلام کا اقتصادی نظام

مولانا کی یہ تصنیف اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم ترین کتاب ہے ہرچند کہ اس موضوع پر مولانا سے پہلے اردو زبان میں چند اور کتابیں لکھی گئیں، مگر اس کتاب کو ان میں تقدم کا مرتبہ حاصل ہے یہ کتاب اصل اشتراکیت

اور سرمایہ دارانہ نظام کا ایک خوب صورت رد ہے اس کتاب کا سب سے اہم
پہلو یہ ہے کہ مولانا نے اسلام کے علاوہ تمام معاشی نظریات کو ذکر کر کے ان پر
اسلامی نقطۂ نظر کی ترجیح کو ثابت کیا ہے نیز جدید معاشی نظام سے کھل کر
بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام ان سب میں
اعتدال کی راہ پر گامزن ہے اہم ترین کام یہی ہے کے اس کتاب میں اسلامی
اقتصادی نظام کا ایک مثبت خاکہ پیش کیا گیا ہے،

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

ندوۃ المصنفین کے دور میں مولانا
کی تیسری اہم ترین کتاب اخلاق و
فلسفۂ اخلاق ہے، اس کتاب سے
اردو میں ایک نئے فن کا آغاز ہوتا ہے، اس سے قبل بھی اردو میں
چند کتابیں موجود تھیں مگر نامکمل اگر ان میں قدیم نظریات سے بحث کی
گئی تو جدید نظریات سے ہاتھ کو کھینچ لیا گیا کسی نے جدید نظریات کو موضوع
بحث منتخب کیا تو قدیم مباحث کو خیرباد کہہ دیا، تقابلی مطالعہ تو بہت دور
کی بات ہے،
مگر یہ کتاب قدیم و جدید، مذہبی و دنیاوی نظریات کا ایک خوب صورت
سنگم ہے یقیناً یہ موضوع جتنا اہم ہے اتنا ہی گنجلک بھی، یہی وجہ ہے اکثر
مصنفین نے اس موضوع سے روگردانی کی اور اردو زبان کا دامن اپنی
تمام تر وسعتوں کے باوجود یہاں آکر خالی خالی نظر آتا ہے جبکہ اس سے قبل
علماء اسلام نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ کا تصور
کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، امام رازی، غزالی، شیخ سعدی، رومی،
شاہ ولی اللہ وغیرہ حضرات نے اس موضوع پر خوب دل کھولکر دادِ تحقیق پیش

کی، مگر اب تک اردو زبان اس موضوع کی تمام تر خوبیوں کے باوجود تہی
دست تھی، مولانا سیوہاروی کے قلم نے اس خلاء کو پُر کیا مولانا نے اس کتاب
میں نفس، نفسیات، ماحول جیسے اہم موضوعات پر خاص طور سے بحث فرمائی،
اسلامی اخلاقی نظام کے سلسلے میں خیر و شر، نفس و روح، اخلاقِ فاضلہ جیسے
امور پر خاص تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی ہے اور استدلال میں قرآن و حدیث
سے تقویت پہونچائی ہے بہر حال مولانا کی یہ تالیف جو اردو کے خزانے میں
متاعِ گراں کا اضافہ کرتی ہے ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے،
علاوہ ازیں ندوۃ المصنفین کے قائم ہونے سے قبل مولانا نے چند کتابوں
کو اور وجود بخشا جنکا ضمنی ذکر گذر چکا قدرے تفصیل پیشِ خدمت ہے،

نور البصر فی سیرۃ خیر البشر

یہ کتاب سیرتِ رسولِ کریم کے نام سے معروف ہے جسکو مولانا نے اپنے
استادِ محترم علامہ انور شاہ کشمیری کے ایماء پر ڈابھیل کی زندگی میں اسکولوں
کالجوں کے اسٹوڈینٹس کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تحریر فرمایا
سیرتِ نبوی پر مشتمل ایک بہترین اور معتمد درسی کتاب ہے جس کے اندر
مختصر الفاظ میں سید المرسلین کی حیاتِ مبارکہ کی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے حیاتِ
طیبہ کے حسین و جمیل خد و خال کی عکاسی کے علاوہ اسلامی نظام کے
نقش و نگار بھی واضح کئے گئے ہیں نیز غیر مسلم متعصب مؤرخین کی جانب سے
کئے گئے اعتراضات کے رد بھی پیش کئے گئے ہیں کتاب کی ضخامت تقریباً ساڑھے

تین سو صفحہ ہے،

تبلیغ دین سے متعلق ہے جیساکہ نام سے ظاہر ہے اور اس کے اندر عہدِ نبوت کے ان تمام پیغامات کو جمع کردیا گیا جو آپؐ نے اپنے زمانے کے سلاطین و امرارِ عالم کے نام لکھے کتاب کے ابتدائی حصہ میں تبلیغِ دین کے اصول پر ضو پاشی کی گئی ہے اور ضروری تشریحات بھی اس نہج پر پیش کی گئی کہ آپکا طریقِ تبلیغ روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجائے، اور علماء و مبلغین اسکو نمونہ و اسوہ بنا سکیں ہر باب کے ختم پر خلاصہ درج ہے تاکہ ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوجائے،

قیام مدراس کے دوران مدراس کے ایک گاؤں پیارم پیٹ میں مقلدین و غیر مقلدین حضرات میں قرارت خلف الامام رفع یدین وغیرہ مسائل پر اختلاف پیدا ہوگیا جس نے نزع کی صورت اختیار کرلی تو مقامی لوگوں نے حضرت مولانا کو دعوت دی آپ تشریف لے گئے مگر مناظرہ یا مباحثہ کی نوبت نہ آئی پھر آپ نے غیر مقلدین کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کا جواب کتابی شکل میں دیا، یہ آپکی سب سے پہلی تصنیف ہے موسوم بہ "حفظ الرحمن لمذہب النعمانؒ"

اچھوتا اسلوب

بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں مگران کی اس زندگی کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے، خدمات، خطابت تحریر وغیرہ بہت سے ایسے امور ہیں جو انسان کو مرنے کے بعد بھی مرنے نہیں دیتے، ایسی ہی ذات مجاہدِ ملت کی ہے یقیناً وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن انکے قلمِ خلاّق کی کاوشوں کا نتیجہ اس خلار کو پر کرنے کے لئے کافی ہے مولانا ایک عظیم لیڈر اور بہت بڑے عالم ہونے کے ساتھ صاحبِ طرزِ ادیب بھی تھے ادبی دنیا میں ان کا اپنا ایکِ مقام ہے، ان کے اسلوب میں نہ کوئی گنجلک اور پیچ وخم ہے اور نہ ہی مبتذل قسم کی کوئی چیز موقع و محل کے اعتبار سے ان کا قلم انداز پیدا کرتا ہے اور خوب پیدا کرتا ہے، وہ تحقیق وجستجو کے موقع پر خواہ مخواہ کی لفاظی سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنی بات کو صاف شفاف انداز میں سامع کے دل ودماغ میں اس طرح اتار دیتے ہیں کہ مخاطب اس کو اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگتا ہے، اور یہی ایک صاحبِ قلم کی خوبی ہے کہ فہمِ مخاطب کے اعتبار سے اسکا انداز بدل جاتا ہو انکا تعلق عوام سے براہِ راست تھا اور زندگی کا اکثر وبیشتر حصہ عوام کے ساتھ میل وجول میں بسر ہو الہٰذا وہ بیک وقت اپنے قلم سے دو طرح کے اسلوب پیدا کر سکتے تھے قصص القرآن، اخلاق وفلسفۂ اخلاق، اور اسلام کا اقتصادی نظام کا انداز خالص علمی ہے جبکہ بلاغ مبین اور سیرت رسولِ کریم جیسی کتابوں کا طرزِ تحریر بالکل عام فہم اور سلیس ہے چنانچہ دونوں قسم کی کتابوں کا ایک ایک اقتباس بطورِ مثال پیشِ خدمت ہے، (۱) فتح مکہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب عزت واحترام کے ساتھ مکہ معظمہ میں

داخل ہو گئے تو قریش ہی کا ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا مگر
خوف ودہشت کی وجہ سے کانپ رہا تھا اور منھ سے بات نہ نکلتی تھی آپ نے
نہایت شفقت ومہربانی سے ارشاد فرمایا گھبراؤ نہیں اور خوف کو دل سے نکال دو
میں قریش ہی کی ایک خشک گوشت کھانے والی عورت کا بیٹا ہوں،

سیرت رسولِ کریم صفحہ ۱۲۷

(۲) عصمتِ انبیاء کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں)
سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہے مگر زلّت کیا ہے ؟ تو اسکا
اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرّد اور سرکشی
کا دخل ہو اور نہ قصد وارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا، اور ساتھ ہی
وہ عمل اپنی حقیقت وماہیت کے اعتبار سے قبیح بد اور شر بھی نہ ہو ان تمام
امور کے پیش نظر وہ ذات میں اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے
والی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اسکے عظیم رتبہ کے سامنے نازل اور ہلکا
نظر آتا ہو، بایں ہمہ اس لئے عمل میں آگیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں
اس کا اس قدر کرنا خدا کی مرضی کے خلاف نہ تھا لیکن نبی پر چونکہ خدا تعالےٰ کی
مستقل حفاظت اور نگرانی رہتی ہے اسلئے فوراً ہی اسکو متنبہ کر دیا جاتا ہے،
کہ یہ عمل تمہاری جلالتِ قدر اور عظمتِ مرتبہ کے شایانِ شان نہیں ہے اور
قطعی غیر مناسب ہے،

قصص القرآن صفحہ ۴۳ جلد ۱

میدانِ سیاست کا بے نظیر ہیرو

تعلیمی تدریسی تصنیفی ذوق کے ساتھ ساتھ مولانا کو سیاست کے شجر پرخار سے بھی گہری دل چسپی تھی یوں کہنے کو تو مولانا کی سیاست کا آغاز جمیعۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہوتا ہے لیکن اگر تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے اور مولانا کے حالاتِ زندگی کا بنظرِ عمیق مطالعہ کیا جائے تو ان کو سیاست کی پرخار وادی میں لے جانے والا اصل محرک آپ کی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند ہے، چنانچہ ۱۹۲۶ء میں علامہ انور شاہ کشمیری اور دارالعلوم کی مجلسِ منتظمہ کے درمیان نااتفاقی پیدا ہوگئی تھی جسکے اندر مولانا نے ایک اُبھار دل ادا کیا اور اپنی آتشیں تقاریر سے اس پژمردہ تحریک کے اندر نئی تازگی بخشی یہیں سے مولانا کی اصل سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے سیاسی نشو نما میں ان کے جگری دوست مولانا بشیر احمد (بھٹہ) کی رفاقت کو بڑا دخل ہے،

عنفوانِ شباب ہی سے وطن کو غلامی کے طوق سے نجات دلانے کیلئے سفر کئے اجلاس بلائے یہاں تک کہ اپنی انتھک محنت اور جد و جہد کے سبب ملک کے چیدہ و چنیدہ لیڈروں میں ممتاز مقام حاصل کرلیا جگہ جگہ آزادیٔ ہند سے متعلق

جلسے جلوس ہونے لگے بھلا مولانا ایسے موقع پر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے سیوہارہ میں بھی ایک تاریخی اجلاس ہوا جسکا نظم ونسق حافظ ابراہیم صاحب کی زیرِ قیادت تھا صدارت حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے فرمائی یہ جلسہ کیا تھا گویا کہ اعلانِ جہاد تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شجاعت و حق شناسی کے جوہر چمکے اور جس بارآور درخت کی تخم ریزی علامہ انور شاہ کی فکر رسانے کی تھی اس کی شاخیں ۱۹۶۲ء تک پھیلتی رہیں،

جمعیۃ العلماء میں شمولیت

۱۹۱۹ء میں جب جمعیۃ العلماء ہند کی تاسیس عمل میں آئی تو آپ نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنی فکرِ رسا معاملہ فہمی وقت شناسی، دور بینی دور اندیشی، نیز استقلال وثبات قدمی کا لوہا منوالیا جسکے نتیجہ میں آپ کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا، پھر آپکی پر وقار شخصیت کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ جمعیۃ العلماء ہند جیسی مقبول عام تحریک نے اپنے سالانہ اجلاس لاہور میں بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو مجاہدِ ملت کا خطاب دے کر باتفاق رائے ناظمِ اعلےٰ چن لیا اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مفتیٔ اعظم مفتی کفایت اللہ جیسے اکابرِ ملت وزعماء امت کی موجودگی میں آپ کو نظامتِ عمومی تفویض کی گئی یہ آپ کے ذمے ایک خدمت ہی نہ تھی بلکہ ایک غیر معمولی امتحان بھی تھا،

جمعیۃ العلماء“ کے پلیٹ فارم پر۔۔

مولانا مرحوم نے اس منصبِ عظیم کا حق جس حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا وہ درحقیقت انہی کا حصّہ تھا مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری سانس تک یعنی مسلسل ۴۰ سال تک جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے ملّتِ اسلامیہ کی خدمات انجام دیتے رہے ابتداءً جمعیۃ علماء عوام سے زیادہ علماء کی جماعت تھی اور دستور اساسی کے اعتبار سے بھی اسکی کاگردگی اتنی وسیع اور ہمہ گیر نہ تھی تحریک آزادی اسوقت اپنی آخر منزل پر تھی اسی سال ۱۹۴۲ء میں کوئیٹ آف انڈیا کی آخری تحریک برپا ہوئی جس کے سلسلے میں بہت سے قائدینِ جماعت کو گرفتار کر لیا گیا انھیں کے ساتھ ساتھ مجاہدِ ملت بھی دو سال تک قید و بند کی زندگی گذارنے کے بعد ۱۴ر جولائی ۱۹۴۴ء کو بریلی جیل سے رہا ہو کر آئے اور اپنے نامکمل کاموں کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور جمعیۃ علماء کو ایک نئی تاریخ اور نیا دور بخشا مولانا کی انتھک کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ جمعیۃ علماء دستوری تنظیمی اعتبار سے ملک بھر کے مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت بن گئی اور آج سرزمینِ ہند کی کوئی ریاست کوئی علاقہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں جمعیۃ علماء کی مقبولیت اور اعتماد نے اپنا اثر قائم نہ کیا ہو یقیناً بہت سے علاقے اور ریاستیں تو ایسی ہیں جنھوں نے جمعیۃ علماء کو مجاہد ملت ہی کے نام سے پہچانا

راجستھان، کرناٹک، میسور، مالابار بنگلور، گورگ، اور مدھیہ پردیش، جیسے علاقوں میں مولانا مرحوم نے در در کی خاک چھان کر جمعیۃ العلماء کی قیادت کا پرچم لہرادیا

جمعیۃ مجاہدِ "ملت" کے دور میں

جس زمانے میں مولانا کو نظامت کا اعلیٰ منصب تفویض کیا گیا وہ زمانہ یقیناً مالی اعتبار سے کش مکش کا زمانہ تھا، جمعیۃ کا نہ اپنا اخبار تھا اور نہ ہی پریس وبک ڈپو جمعیۃ کا دفتر اس وقت کرائے کا ایک مکان تھا صرف ایک کارندہ اور محرر ہی اسکی تمام بساط تھی، نہ ٹیلی فون تھا اور نہ ٹائپ مشین، عوام وخواص کے رجوع کے اعتبار سے بھی اس کا دائرہ محدود تر تھا، لیکن مجاہدِ ملت کے دورِ نظامت میں جمعیۃ کا اپنا اثاثہ لاکھوں کی مالیت کا ہوگیا اسکی اپنی جائیداد بھی اسٹاف میں اضافہ ہوا، اور ہر ملک سے مراسلت کا رابطہ پیدا ہوا،

دنیا میں کسی بھی زندہ جماعت اور تنظیم کی آواز اخبار ور سائل ہی کے ذریعے پھیلتی ہے اسلئے مولانا نے ۱۹۴۷ء میں اخبار کا اجرار کرایا جبکہ یہ اخبار اس سے پہلے بھی جاری ہوا تھا مگر برطانوی اقتدار اس کی تاب نہ لاسکا تھا غرضیکہ مجاہدِ ملت کے دور میں ہر طرح کی سہولیات فراہم ہو گئیں،

مجاہدِ ملت کے دور میں جمعیۃ کے آٹھ سالانہ اجلاس ہوئے جس کا مختصر خاکہ یہ ہے،

(۱) جمعیۃ علماء کا تیرھواں سالانہ اجلاس ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا اسی اجلاس میں آپ کو نظامتِ عمومی سے سرفراز فرمایا گیا،

(۲) جمعیۃ علماء ہند کا چودھواں سالانہ اجلاس مئی ۱۹۴۵ء شہر سہارنپور میں ہوا صدرِ اجلاس حضرت شیخ الاسلام اور صدر استقبالیہ خواجہ اطہر حسین تھے

(۳) جمعیۃ علماء ہند کا پندرھواں سالانہ اجلاس زیرِ صدارت حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ ۲۶ / ۲۷ اپریل ۱۹۴۸ء بمبئی میں ہوا جس کا افتتاح حضرت مولانا آزاد نے کیا اور وزیرِ اعظم ہند پنڈت نہرو بھی اس میں شریک تھے

(۴) جمعیۃ العلماء ہند کا سولھواں سالانہ اجلاس ۱۶ / ۱۷ / ۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو لکھنؤ میں ہوا جس کی صدارت حضرت شیخ الاسلام مدنی نے کی اور مولانا مصطفیٰ حسین صاحب صدر استقبالیہ تھے،

(۵) جمعیۃ علماء کا سترھواں سالانہ اجلاس ۲۷ / ۲۸ / ۲۹ اپریل ۱۹۵۱ء کو حیدر آباد دکن بصدارت شیخ الاسلام مدنی منعقد ہوا حکیم مقصود جنگ مرحوم

صدرِ استقبالیہ تھے،

(۶) جمعیۃ علماء ہند کا اٹھارھواں سالانہ اجلاس ۱۱ر۱۲ر۱۳ر فروری ۱۹۵۵ء کو شہر کلکتہ میں زیرِ صدارت حضرت مدنی منعقد ہوا،

(۷) جمعیۃ علماء ہند کا انیس واں سالانہ اجلاس ۲۷ر۲۸ر۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو سورت شہر میں منعقد ہوا صدر حضرت شیخ الاسلام اور صدرِ استقبالیہ مسٹر غلام رسول قریشی تھے،

(۸) جمعیۃ علماء ہند کا بیس واں سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۶۰ء میں زیرِ صدارت حضرت مولانا فخر الدین صاحب شہر اجین میں منعقد ہوا صدرِ استقبالیہ مولانا مفتی محمود احمد صدیقی صاحب تھے،

مولانا کا کانگریس سے تعلق

ملک کی آزادی سے قبل کانگریس میں داخل ہونا انتہائی خطرناک اور حوصلہ طلب امر تھا، لیکن یہ مولانا ہی کی ذات تھی جو اپنے شعور کے وقت سے لے کر تا دمِ آخر پورے عزم و استقلال کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہی جوں جوں ملک کے اندر سیاسی انتشار اور باہمی مخالفت زور پکڑتی رہی اتنا ہی یہ تعلق پختہ ہوتا چلا گیا تا آنکہ جذبات کے انتہائی عروج اور نظریات کے شدید تصادم کے اس دور میں بھی مولانا کے اس تعلق میں کوئی کمی نظر نہیں آئی

۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے پرشوتم داس ٹنڈن کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے ٹنڈن جی کا دورِ صدارت کانگریس کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے اندرونی خلفشار آپسی ناچاقی اور نظریاتی تصادم کی بنا پر ان کو گیارہ مہینہ انتہائی کشمکش میں گذارنے کے بعد بالاخر اپنے عہدۂ صدارت سے دست بردار ہونا پڑا رفیع احمد قدوائی جیسے کٹر کانگریسی لیڈر بھی اس زمانے میں الگ ہو گئے تھے، مسٹر نہرو اور مولانا آزاد نے بھی یہ تمام زمانہ انتہائی بے رخی کے ساتھ گذارا لیکن مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ٹنڈن جی سے اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود اپنی محبوب ترین جماعت کانگریس کو نہ چھوڑا،

دراصل مولانا ملک کے سیاسی بحران میں کانگریس ہی کو سچے اصول کا علمبردار گردانتے تھے مولانا مرحوم کے لئے کانگریس کے ساتھ اتنی گہری اور عملی وابستگی تمام عمر ایک کڑی آزمائش بنی رہی جس کے سلسلے میں انھوں نے خود اپنے ہم مذہب اور ہم وطنوں کے لعن وطعن کی اذیت سہی ہر طرح کے نقصانات اور حوصلہ شکن صدمے برداشت کئے

نہ اپنی صحت و تندرستی کی پرواہ کی اور نہ ہی اپنی زندگی کی راحت اور کسبِ معاش
کی فکر بلکہ ہمیشہ ایک اصول پسند کی حیثیت سے استقامت و استقلال کیساتھ
کانگریس سے وابستہ رہے مولانا نے کانگریس کو فکری لالچ سے بلند
ہو کر اپنایا تھا، انکی بے نظیر اور انتھک کوششوں کا واحد مرکز کانگریسی
تحریکوں کو کامیاب بنانا اور مردہ تحریکات میں عقابی روح پیدا کرنا تھا
اسی کیلئے انکی تمام کوششیں تھیں اور یہی انکی تمام تر سرگرمیوں کا ماحصل
اور مطمحِ نظر تھا آزادیٔ وطن کی خاطر جب جب قید و بند اور گرفتاری
کی نوبت آئی تو مولانا نے یہ کہتے ہوئے قبول کرلیا،

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جرأتِ رندانہ

انڈین نیشنل کانگریس اور اسکی تمام شاخیں ۱۹۳۲ء سے خلافِ قانون تھیں کہیں
اسکا اجلاس نہیں ہو سکتا تھا مگر اس کے باوجود کانگریس نے متفقہ
طور پر یہ فیصلہ کیا کہ سالانہ اجلاس منعقد ہوگا اور اسکے لئے گھنٹہ
گھر چاندنی چوک جیسا صدر مقام طے کیا گیا جو اس وقت دہلی کا سب سے
زیادہ پر رونق بازار تھا، حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اجلاس نہیں
ہوگا اسلئے پورے ہندوستان کی سی، آئی، ڈی کو متنبہ کردیا گیا
حتی کہ ریلوے اسٹیشن، ویٹنگ روم، اور ٹرین میں ہر جگہ سی، آئی،
ڈی موجود تھی اور جلسہ کو ناکام بنانے کی حتی الامکان کوششیں کی
گئیں مگر جلسہ ہوا اور پوری آب و تاب کے ساتھ منعقد ہوا مجاہد ملت
نے جو خطرے مول لیکر اس جلسہ میں شرکت کی وہ قابلِ رشک ہے،

غالباً مولانا مرحوم اس وقت وطنِ مالوف سیوہارہ میں مقیم تھے مقامی پولیس کو یہی گمان رہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن ممبرآئی سی، سی یہیں موجود ہیں اسلئے دہلی ریلوے اسٹیشن کی سی، آئی ڈی کو کانوں کان بھی یہ خبر نہ مل سکی کہ یہ جانباز مجاہد جو کھدّر کے لباس میں ملبوس رہتا تھا آج لٹھے کا پائجامہ، ولایتی کپڑے کی شیروانی، جے پوری صافہ، عمدہ چھڑی بقول قاضی اکرام الحق صاحب مولانا ایک نواب کی شان سے اسٹیشن پر اترے، اور سی،آئی، ڈی کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ ایک ڈاڑھی والا نوجوان جو نوابی شان سے ہمارے سامنے سے گذر رہا ہے وہ کھدّر والا حفظ الرحمٰن ہے،

برطانوی سامراج کے دور میں اپنی رہبرانہ صلاحیتوں کی قیمت قید و بند کی صورت میں ادا کی اور بالآخر اسوقت کے صفِ اول کے قائدین مسٹر پنڈت نہرو، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، محمد علی جوہر کے دوش بدوش جنگ آزادی لڑکر وطن کو آزاد کرایا، اگر غیر متعصبانہ طریقے پر غور و خوض کیا جائے تو تاریخِ آزادی کا طالب علم یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہرچند مولانا کیساتھ بہت سے چوٹی کے قائدین تحریکِ حرّیت میں شامل تھے مگر مولانا کی شخصیت ہر ایک سے الگ نظر آتی تھی

کانگریسی سپاہی

اترپردیش کانگریس کمیٹی میں مولانا عرصۂ دراز تک ایگزیکٹیو کے رکن رہے ۱۹۳۶ء سے آخر تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صفِ اول کے قائدین میں شامل رہے

آزادیٔ ہند کے بعد کانگریس کے ٹکٹ پر تقریباً چودہ سال تک دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوتے رہے اے آئی سی سی کے ہر اجلاس میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ شریک ہوتے اور پیش آمدہ مسائل پر تقریر بھی کرتے الیکشن کے زمانے میں پورے جوش و خروش اور سچے جذبے کیساتھ کانگریسی امیدواروں کی فلاح و کامیابی کے سلسلے میں ملک کے کونے کونے کا سفر کرتے اور جہاں تہاں جاکر تقریر کرتے امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء کے جنرل الیکشن میں مولانا کا مقام ان کانگریسی قائدین میں تھا جنکے بے پناہ اثر و نفوذ اور ساحرانہ تقاریر پر کانگریس کی کامیابی کا مدار رہتا،

سچّا کانگریسی

ہندوستان کی آزادی کے بعد اتحاد و اتفاق کا شیرازہ بکھر چکا تھا بے غرضی اور خلوص کی جگہ اکثریت کی فرقہ پرستی اور نفسا نفسی نے سر اٹھا لیا تھا اور ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیت کے واجبی حقوق کو پامال کرنے پر کمر باندھ لی گئی تھی، ان نازک حالات میں مولانا اٹھے اور اپنی کشتی کے ان ہم رکابوں کا کاندھا پکڑ کر جھنجوڑا جو کل تک جیل کے ساتھی اور آج اقتدار و اختیار کے مسند نشیں تھے گاندھی جی پنڈت نہرو، سردار پٹیل کا ہاتھ پکڑا منسٹروں چیف منسٹروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے کہا،

ہم بغل گیر تمہارے ہیں غنیمت سمجھو ⁖ ہم جو اُٹھ جائیں گے پہلو سے تو پچھتاؤ گے
مل کے رہنے کا سبق ہم نے دیا تھا تمکو ⁖ تم تو بکھرے ہوئے تھے اور بکھر جاؤ گے

ایک اور موقع پر تقسیم ہند سے متعلق بحث و مباحثہ کے وقت فرمایا

کسی بھی جائز شکایت کے موقع پر ہماری آواز کو پاکستان یا لیگ کا نام لیکر دبانے کی کوشش نہ کی جائے، ہم نے وطن کو آزاد کرانے کیلئے اس طرح اپنی جانیں قربان کی ہیں جس طرح دوسروں نے، اس کی درو دیوار پر ہمارے نام کندہ ہیں، اگر آج سرزمینِ ہندوستان پر جواہر لال نہرو، اور سردار پٹیل کو رہنے کا حق ہے تو حسین احمد، کفایت اللہ اور حفظ الرحمٰن کو یہ حق بدرجہٗ اولیٰ حاصل ہے،

نیز فرمایا ہندوستان ہمارا ملک ہے یہ روایت کا مخزن اور ہماری تہذیب وثقافت کا گہوارہ ہے اسکی درو دیوار پر ہماری ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں،

نمک پر محصول

کانگریس کے پلیٹ فارم سے مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کا اکثر وبیشتر سلسلہ قیام ڈابھیل کے دوران شروع ہوا جس وقت گاندھی جی نے نمک پر محصول کے بائکاٹ کا اعلان کیا ان دنوں وہ دھراشنٹہ میں مقیم تھے مولانا اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب گاندھی جی سے ملے اور تحریک کے اندر اپنی خدمات کی پوری طرح یقین دہانی کرائی گاندھی جی ان لوگوں کے جذبات سے بے حد متاثر ہوئے اور ساتھ ہی کہا کہ پیغمبرِ اسلام کی کوئی ایسی ہدایت ہے جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ نمک پانی گھاس رفاہِ عام کی چیزیں ہیں اسلئے انکو سرکاری ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے مولانا اور حضرت مفتی صاحب نے اسکی تصویب فرمائی اور آقائے نامدار کی حدیث گاندھی جی کو مع ترجمہ لکھ کر دی جسکو دیکھ کر گاندھی جی بہت خوش ہوئے،

عدمِ ادائیگی ٹیکس کی بنا پر عوام کی جو جائدادیں برٹش حکومت ناجائز طور پر ضبط کر کے سستے داموں پر نیلام کر رہی تھی عوام کو انکے خریدنے سے باز رکھنے کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر سے مفتی صاحب نے اپنا مشہور فتویٰ صادر فرمایا جس میں ضبط شدہ جائدادوں کو خریدنا شرعی طور پر ممنوع قرار دیا گیا تھا، برٹش حکومت اسکو کس طرح برداشت کر سکتی تھی چناں چہ مفتی صاحب کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے مولانا حفظ الرحمٰن پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے۔ بہر حال ان دونوں بزرگوں کی سیاسی سرگرمیوں نے ڈابھیل کے منتظمین کو کافی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا جسکی طرف سے ان لوگوں کی نظریں بھی بند نہ تھیں،

ے جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضہ دیکھ لیتی ہے

مولانا تو پہلے ہی سے قید و بند کی زندگی گذار رہے تھے ادھر مفتی صاحب بھی مستعفی ہو گئے اسطرح ڈابھیل کا تعلق منقطع ہو گیا تھا،

پارلیمنٹ کیلئے مولانا کا انتخاب

حصولِ آزادی کے بعد مولانا کی پارلیمانی زندگی کا سفر اسوقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب کیے گئے اس پارلیمنٹ کو برطانوی پارلیمنٹ کی جگہ لینا تھی اور آزاد ہندوستان کی قیادت کا وہ نازک فریضہ ادا کرنا تھا جس پر اس کی آئندہ تاریخ کی بنیاد قائم ہو اس دور میں مولانا نے پارلیمنٹ میں جو کردار ادا کیا اور اپنی بے مثال جرأت سے اپنا جو مقام بنایا وہ تاریخ کا زریں باب ہے، مولانا کی پارلیمانی زندگی میں سب سے اہم عنصر انکی تقاریر یں ہیں لیکن ان کی تقریریں موقع و محل کے اعتبار سے ہوا کرتی تھیں، ایسا نہیں ہوتا کہ مذہبی جلوس میں پارلیمانی اور پارلیمنٹ میں عوامی تقریریں ہوں بلکہ مذہبی اجتماع میں مذہبی، عوامی جلسوں میں عوامی، اور پارلیمنٹ میں پارلیمانی، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مولانا نے میانِ تقریر پارلیمانی آئین کی خلاف ورزی کی جیسا کہ آج کل ممبران شہرت کیلئے غیر پارلیمانی زبان استعمال کرتے ہیں، مولانا کا طرزِ عمل سب سے جداگانہ تھا وہ شہرت اور نام کمانے کے درپے نہیں تھے حق گوئی انکا شیوہ تھا وہ حق بات کہنے میں کسی بھی بڑی سے بڑی پارٹی یا بڑے سے بڑے لیڈر کی پرواہ نہیں کرتے تھے ایک مرتبہ وزارتِ داخلہ کے معاملات پر بولتے ہوئے حکومتِ مدھیہ پردیش کو ایسے

جرأتمندانہ انداز میں للکارا کہ اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو بے چین ہو اٹھے ، فرمایا، جبلپور، ساگر، موہ کٹنی میں فسادات ہو جائیں اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال آبرو برباد ہوتے دیکھتے رہیں یہ انکے لیئے کیسے جائز ہو سکتا ہے ، اقلیت کا سوال ہو یا اکثریت کا ہمیں سب ہی کی حفاظت کرنی ہے ، خاص طور سے اقلیتوں کی پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ، میں چاہتا ہوں کہ اس طرف پوری توجہ دی جائے کیوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے آزادی کا سوال ہے ملک کے وقار کا سوال ہے اور ملک کی سالمیت کا سوال ہے ،

غلط خدشہ کی تردید

مولانا مرحوم پارلیمنٹ میں صرف مسلمانوں کے نمائندہ بن کر نہیں گئے تھے مگر جہاں کہیں اقلیت کے ساتھ بے انصافی دیکھی تو اسکے خلاف آواز اٹھانا اپنا نصب العین سمجھا اسی وجہ سے یہ خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مرحوم نے پارلیمنٹ کو صرف مسلمانوں کیلئے اپنایا تھا لیکن یہ درست نہیں ہے کیوں کہ دستور ساز اسمبلی کیلئے قومی بنیاد پر ہی انکا انتخاب عمل میں آیا تھا، اقلیتی مسائل پر بولنے کیلئے انکو صرف اسلئے مجبور ہونا پڑتا تھا کہ دوسرے ممبر اس مسئلہ پر لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے تھے ایسا بھی نہیں کہ مولانا مرحوم اقلیتی معاملات کے علاوہ کسی دوسرے معاملے میں اپنی زبان پر مہرِ سکوت ثبت کیئے ہوئے ہوں، خدائے عزوجل نے پارلیمنٹ میں بھی مولانا کو مقبولیتِ عام سے نوازا تھا مولانا جب آخری بار پارلیمنٹ کیلئے چنے گئے تو علالت کا یہ عالم تھا

کہ وہ کسی ووٹر کے پاس نہ جا سکے جس پر الیکشن میں کامیابی کا انحصار ہے مگر اسکے باوجود ۱۰/ہزار ووٹوں سے کامیاب ہوئے یہ مجاہد ملت کی مقبولیت عام کی روشن دلیل ہے جب مولانا کو نتیجہ کی خبر ملی تو آنکھوں سے خوشی کے اشک جاری ہو گئے کہ اس قدر مخالفانہ پروپیگنڈہ کے باوجود عوام کو اب تک ان پر اتنا اعتماد ہے ،

قافلہ سالار

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور جس میں مسلم لیگ کی ایک خاص سیاست ہندوستان میں مدو جذر پیدا کر چکی تھی جس کے تئیں قوم پرور حلقے مسلمانوں کی نظر میں نہ صرف شکوک و شبہات بلکہ لعن و طعن کا ہدف بنے ہوتے تھے یہی زمانہ تھا جب بہت سوں کے پائے استقامت میں لغزش پیدا ہوئی آج داؤد غزنوی کانگریس سے گئے اور کل افتخار الدین ، صبح نواب اسماعیل نے خیرا باد کہا تو شام کو چودھری خلیق الزماں نے ، یہاں یہ شخصیت ڈوبی وہاں وہ ستارہ ٹوٹا لیکن ان سب حالات میں سب سننے کے باوجود سب کچھ سہتے ہوئے ایک ہی شخصیت تھی جو اپنی راہ پر قائم ، اپنی منزل کی تلاش میں قافلہ سالار کی حیثیت سے چل رہی تھی

مولانا نے جو مسلکِ سیاسی اختیار کیا تھا کسی ضد ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ دو اور دو چار کی طرح یہ بات بالکل صحیح سمجھتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کیلئے یہی راہ ہے یہی منزل ، وہ جانتے تھے کہ آج نہیں تو کل انکی رائے کی اصابت تسلیم کرلی جائے گی ،

مُجاہدِ ملّتؒ

اور

خدمات

ہندوستان کی آزادی کے بعد ایسا انتشار پیدا ہوگیا تھا کہ انسان انسان کا دشمن بن گیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانوں نے انسانیت کی چادر کو تار تار کرکے درندگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہو دیکھتے ہی دیکھتے چمنستان ہند ایک محشر قتل تھا جہاں کل تک اخوت و بھائی چارگی کے گیت گائے جاتے تھے آج وہ میدانِ قیامت تھا ہر طرف جوانوں بوڑھے بچوں کی نعشیں تڑپتی اور دم توڑتی نظر آتی تھیں ۱۹۴۷ء کے ان لرزہ خیز ہنگاموں سے صرف انسانوں کے دل ہی نہیں لرزتے بلکہ انسانیت کی نظریں نیچی اور شرافت کی گردن جھک جاتی ہے ہر چند کہ انکا فراموش کرنا ہی بہتر ہے انکے ذکر کرنے میں نہ ملک کا فائدہ ہے نہ قوم و ملت کیلئے کوئی بہتری لیکن کسی مجاہد کی حالاتِ زندگی کے خدوخال کو نمایاں کرنے کے لئے اگر ان کی طرف کچھ اشارے کرنے پڑیں تو وہ تاریخ کی ایک ضرورت ہوگی جس سے نظریں بچاکر نکل جانا درحقیقت تاریخ کا خون کرنا ہے اور جبکہ تاریخ کا اصل منشا یہی ہے کہ ماضی کی خرابیوں سے سبق لیکر مستقبل کو بہتر بنایا جائے تو کیوں نہ ہم اپنی اس گذری ہوئی تاریخ کو سامنے رکھ کر آنے والی زندگی کی راہ متعین کریں،

دہلی میں کشت و خون کی گرم بازاری

ان قیامت خیز حالات نے پورے صوبۂ دہلی اور مغربی یوپی کے تقریباً ایک درجن اضلاع نیز راجستھان کے ان تمام علاقوں کو جو پاکستان کی سرحد سے ملتے تھے تباہی و بربادی کے اس طوفان کی ندر کر دیا تھا جو مغربی پنجاب اور سندھ سے امنڈ کر آرہا تھا خود مسلمانوں کی حالت یہ تھی سب لیڈر اور رہنما جنکے بل بوتے پر پاکستان کے حامیوں نے گذشتہ دس سال سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تھے پاکستان کا ہر ایک حامی نہ صرف مصیبت زدہ اور مایوس تھا بلکہ خود اپنے کو مجرم سمجھ رہا تھا ان تمام حالات میں تمام قوم پرور رہنماؤں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ تین کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں موجود ہیں انکی پوزیشن کیا ہو، شیخ الاسلام مولانا سید حسین مدنی، مفتی محمد کفایت اللہ، امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد، سحبان الہند مولانا احمد سعید اور انکے رفقاء نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دیں انکی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں مگر جہاں تک دہلی کا سوال ہے تو بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے سب سے زیادہ جرأت و ہمت کیساتھ اس سوال کو حل کیا، جان کی بازی لگا کر شب و روز کے ہر لمحے کو اپنی جد وجہد سے زندہ جاوید بنا دیا،

حادثۂ جانکاہ

۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کا دن حفظ الرحمن کی زندگی کا ایک فیصلہ کن دن تھا جبکہ غم اور مسرت دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے مسرت اس بات پر تھی کہ ملک آزاد ہو گیا اور غم اس کا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے جس نتیجے میں سرحد کے دونوں طرف شرافت وانسانیت کا ننگا ناچ ہو رہا تھا ایسے وقت ایک اور کوہِ غم یہ ٹوٹا کہ ۲؍ یا ۳؍ ستمبر ۱۹۴۷ء کو آپ کی نہایت چہیتی بیٹی خالدہ ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گئی جو دو تین سال سے تپ دق میں مبتلا تھی

؎ دل بے قرار ہے تو نظر اشک بار ہے
تسکین قلب و روح کا ساماں گذر گیا

ابھی غم کے آنسوں خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ یہ جانکاہ خبر ملی مشرقی پنجاب میں جو طوفانی سیلاب آیا ہوا تھا اسکی موجیں دہلی تک پہونچ چکی ہیں اور چلتی گاڑیوں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے یہ سُن کر مولانا سے رہا نہ گیا دِل بھر آیا اور لاڈلی بیٹی کے انتقال کے اگلے روز تمام اعزہ واقربا کو روتا ہوا چھوڑ کر دہلی کے لئے روانہ ہو گئے

؎ مانا کہ رنج وغم نے مارا ہے مجھے
ہر تلخی وترشی بھی گوارا ہے مجھے
للہ ذرا وقت کے نبّاض سمجھ
ملت کی تباہی نے مارا ہے مجھے

جس گاڑی پر مولانا سوار ہوئے اس پر بھی حملہ ہوا ظاہر ہیکہ اسکا اصل نشانہ موصوف ہی تھے مگر چشم فلک نے دیکھا کہ قضا وقدر کا فیصلہ آڑے آگیا

اور فوج کا ایک اعلیٰ افسر سکھ جو مولانا کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے ان غنڈوں کو دھمکا کر واپس کر دیا

مایوسی کے ظلمت کدہ میں امید کی کرن

دہلی پہونچ کر مولانا نے جو کچھ کیا کاش دہلی کے در و دیوار اور گلی کوچوں کو قوتِ گویائی ہوتی تو وہ آپکو بتاتے کہ مولانا نے شعلہ جوالہ بنے ہوئے دہلی کو کس طرح آگ کی لپیٹ سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور صبح و شام ایک چھوٹی سے وین میں دہلی کا گشت لگاتے پھرتے جس پر بارہا سنگ باری ہوئی اور لاٹھیاں چلیں پتھر برسے مگر مولانا کی ذات تھی کہ اس پر نہ خوف و ہراس تھا نہ چہرے پر اداسی وافسردگی کے اثرات، ایسے وقت میں جبکہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی سرزمین پر طوفانی بھونچال آیا ہوا تھا تو دہلی کا تمدن مسلمانوں کی معاشرت بلکہ ساری زندگی زیر و زبر ہو کر رہ گئی تھی فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے خونی ہنگامہ شباب پر تھا دہلی کے چپے چپے سے آہ و بکا کی صدائیں گونج رہی تھیں لوگ گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے تھے،

مجسمۂ شجاعت

اس موقع پر مولانا ایک مرتبہ شہر کا گشت لگا رہے تھے ایک جگہ دیکھا کہ کچھ نہتے مسلمان کسی مؤمن کی نمازِ جنازہ کی تیاری میں مشغول ہیں جنازہ سامنے رکھا ہوا تھا مولانا تیزی سے اس مقام پر پہونچے تو صف بندی ہو چکی تھی چند بے خوف اور صاحب ایمان مسلمان اس مالکِ حقیقی کے سامنے اپنے بھائی کی مغفرت

کیلئے دعائیں کر رہے تھے جو ظلم کا شکار ہو گیا تھا مولانا کی نظر سامنے پڑی تو کچھ اور ہی ماجرہ نظر آیا، سامنے کچھ فوجی جو اسلحہ سے لیس تھے آگے بڑھے چلے آرہے ہیں، ملٹری کے یہ جوان جنکا ظلم نقطۂ عروج پر تھا انکے خون خوار اور تمتماتے ہوئے سُرخ چہرے پوری طرح دیوانگی کے اثرات لئے ہوئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے ان درندوں نے مظلوم اور بے بس مسلمانوں پر گولی چلانے کا ارادہ کیا، مولانا نے دیکھا کہ مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جو عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی اگر ان پر چند ثانئے اور اسی طرح گذر جائیں تو ان میں سے کوئی نہ بچ سکے گا اس وحشتناک منظر کو دیکھ کر مولانا آناً فاناً موٹر سے کود پڑے اور بڑی تیزی کے ساتھ ان لٹیرے فوجیوں کے سامنے آگئے اور پوچھا کہ ان نہتے مسلمانوں پر تمہیں گولی چلانے کا کس نے اختیار دیا، مولانا کی پر وقار آواز کانپ رہی تھی ملٹری کے خونخوار درندے اس بے باکی اور شجاعت کو دیکھ کر ششدر رہ گئے ان میں سے کسی نے کہا یہ سب مسلمان مل کر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ یہ نہتے مسلمان جن کے سامنے ایک بھائی کا جنازہ رکھا ہوا ہے تم پر حملہ کر سکتے ہیں اگر تم یہ چاہتے ہو کہ مسلمانوں کے خون سے اسی طرح ہولی کھیلتے رہو گے تو یاد رکھو حفظ الرحمن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے مولانا کے آہنی ارادوں نے ان وحشیوں کو پیچھے لوٹنے پر مجبور کر دیا،

ے خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دہلی کے خونی ہنگاموں میں مولانا کی ہی جلیل القدر خدمات تھیں جنکے

بارے میں احرار کے ایک مرحوم قائد نے کہا تھا کہ دہلی میں مولانا نے جو کچھ مسلمانوں کی خدمت کی ہیں اسکا تصور بھی نہیں کرسکتا، اس جملے کی قدر اسوقت معلوم ہو گی جبکہ اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کرلیا جائے کہ یہ مرحوم رہنما آخر میں جمعیۃ العلماء سے شدید نظریاتی اختلاف کی بنا پر نہ صرف یہ کہ جمعیۃ سے علیحدہ ہو گئے تھے بلکہ ایک حد تک مخالفت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکے تھے

دُور اندیشی

کشت وخوں اور غارت گری کا بازار یوں تو ہندوستان میں چاروں طرف ہی گرم تھا مگر دہلی کے اندر آگ کے شعلے پوری شدت سے بھڑک رہے تھے دہلی کے مسلمان ظالموں کی سفاکی اور خونریزی کا شکار بنے ہوئے تھے ان مصائب و آلام کے مارے ہوئے مسلمانوں کے بارے میں سردار پٹیل نے ایک تجویز رکھی کہ مسلمانوں کی حفاظت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ سب مسلمان کسی محفوظ مقام پر پہنچادیئے جائیں اور فوجی پہرے میں انکی نگہداشت ہوتی رہے مگر اس موقع پر بھی مولانا کی دوررس نظر اور تدبر و فراست نے اس تجویز کی پشت پر خوفناک خطرے کو بروقت محسوس کرلیا اور سردار پٹیل کی اس انوکھی اسکیم کو ماننے سے صاف انکار کردیا اور فرمایا مسلمان اپنی حفاظت خود کرنا جانتا ہے میں انکو خدا کے سپرد کرتا ہوں،

ے مجھکو مضطر دیکھ کر کہتا ہے قاتل پیار سے
آ ادھر سائے میں سو جا دامن شمشیر کے

ایسے ہی ایک اور موقع پر مولانا کے بعض ہندو دوستوں نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ پناہ گزینوں کے حفاظتی کیمپ میں منتقل ہو جائیں مگر مولانا نے انکے مشورے کو بڑی سختی کے ساتھ

رد کرتے ہوئے کہا،

ے باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا (اقبال)

خدمات کا غیر متناہی سلسلہ

ان غیر معمولی خدمات کے سلسلے میں قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی فرماتے ہیں ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا کی یہ حالت تھی کہ شعلہ جوالہ بنے ہوئے ہندوستان کا ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتے مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری قطبِ دوراں شاہ عبد القادر رائپوری رحمتہ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کرتے ہیں " مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اگر اپنی ۱۹۴۷ء کی ایک دن کی خدمات کے عوض عبد القادر کے تمام عمر کے مجاہدات لینا چاہیں تو میں اسکے لئے تیار ہوں " گاندھی جی کے بعد مولانا کی شخصیت ہی ایسی ہے جس پر سہیل صاحب کا مندرجہ ذیل شعر فٹ ہوتا ہے،

ے تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ ترے کرم سے اماں ملی
تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ تباہیوں سے بچالیا

یہ طوفانی سیلاب دہلی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا تھا، ہر جگہ مسلمانوں کا ظالمانہ قتل، غارت گری، لوٹ مار، فتنہ وفساد کبھی مبارکپور میں خونریز ہنگامے، گاہے سرزمینِ بھوپال

مسلمانوں کے خون سے داغدار، صبح جبل پور میں صبح قیامت شام علی گڈھ میں شام غربت، بہار، میرٹھ، چندوسی، مراد آباد اور خدا جانے کہاں کہاں خونریز ہنگامے ہوئے لیکن ان سب میں ایک ہی شخصیت تھی جو ہندوستان میں ہونے والے فسادات کا پامردی سے مقابلہ کرتی رہی حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء اور اس سے پہلے کے حالات کسی آدمی پر مخفی نہیں ہیں اسوقت کے پیش آمدہ مصائب و آلام کے بارے میں میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں،

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

نیا ماحول نئے تقاضے

مولانا کی زندگی مصائب و آلام کا نمونہ ہے، ان کی زندگی میں بہت سے حوصلہ شکن حالات پیش آئے مگر انکے پائے استقامت میں کبھی ذرہ برابر لغزش نہ آئی، انھوں نے جو کچھ کیا جیسا بھی کیا سب خلوص اور ہم وطنوں کی خیر خواہی کیلئے کیا، میدانِ سیاست میں قدم رکھنے سے لے کر تا دمِ آخر بہت سے دور آئے متعدد مرتبہ زمانے نے کروٹیں بدلیں لیکن مولانا نے جو اپنا نصب العین اول روز متعین کر لیا تھا اس سے سرِ مو انحراف نہیں کیا، خاص طور سے ۱۹۴۷ء کی قیامتِ صغریٰ نے ایک نیا رخ پیدا کر دیا تھا ہر طرف جبر و تشدد کی تیز و تند ہوائیں چل رہی تھیں اور ایک عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی ایسے پر فتن دور میں مولانا نے جو نہج اختیار کیا وہ وقت کی ضرورت، زمانے کی پکار تھی، قطع نظر اس بات سے کہ وہ اپنے سوچے ہوئے میں کہاں تک کامیاب ہوئے کیوں کہ اگر یہی سوال ہے تو اس کی زد سے مدِّ مقابل بھی اپنا دامن نہیں بچا سکتا، ۱۹۴۷ء کے بعد تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، مسلمانوں کے پاکستان بنا لینے کے بعد ہندوستانی غیر مسلموں کے ذہن میں ہندو راشٹ قائم کرنے کا جذبہ یقینی تھا جس پر چون و چرا کرنیکی گنجائش باقی نہیں رہی تھی

مولانا ابوالکلام آزاد ایسے حضرات بھی منتظر تھے کہ دیکھیں آنے والا کل کیا گل کھلاتا ہے ادھر ہندوستانیوں کی وہ اخوت و بھائی چارگی جسکی بنیاد پر انھوں نے برٹش حکومت کے دانت کھٹے کر ڈالے تھے اب تعصب کا شکار ہو چکی تھی مزید برآں مسلمانوں کا تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقہ ہجرت کیلئے رختِ سفر باندھ رہا تھا یہاں پر صرف دردِ تہ جام باقی تھا، ان حالات کے پیشِ نظر مولانا نے اپنے سیاسی نظریات کو تشکیل دی اور ایک ایسی راہ اختیار کی جو وقت کی ضرورت تھی،

کانگریس میں شمولیت اور اسکے بعد پارلیمنٹ میں داخلہ نیز کانگریسی ممبران کو صحیح پوزیشن پر لانے کیلئے تحریر و تقریر ہر میدان سے سعی بلکہ عملی سعی کی یہ کسی نفسانی خواہش اور مادی خواہش کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ اسکے ذریعے ملک میں بڑھتے ہوئے انحطاط کو روکنا اور آپسی خلفشار کو دور کرنا تھا، وہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کرنا چاہتے تھے کہ دو قومی نظریہ نہ کل صحیح تھا اور نہ آج صحیح ہو سکتا ہے اس نظریہ پر قائم کردہ حکومت ایک فوری جذبہ کا نتیجہ ہے جسکی کوئی حقیقت نہیں ہے، ہندو مسلم ایک تسبیح کے منتشر دانے ہیں جنکو یکجا کرنے کیلئے مولانا نے قسم کھائی تھی اس راہ میں ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے پر کمربستہ ہو گئے تھے،

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

لکھنؤ کی مسلم آزاد کانفرنس

دہلی میں کشت وخون کی اس گرم بازاری نے پورے ملک میں لرزہ اور بحران طاری کردیا تھا خاص طور سے ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت "مسلمان" انتہائی دہشت وسراسیمگی کی گرفت میں آچکی تھی اقلیت واکثریت کا باہمی انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ شاید بٹوارے کے بعد ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کا کوئی موقف نہ ہوگا عین ممکن تھا کہ وہ اپنے تئیں غلامی کا فیصلہ کرلیں ایسی صورت میں اشد ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا اقدام کیا جائے جو وقت کے بدلتے تیور کا رخ موڑ دے اور اقلیت واکثریت کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر کھڑا کردے وقت کے اس تقاضے کو پوری قوت کے ساتھ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کیا اور ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں مسلم آزاد کانفرنس بلائی جو آزاد کانفرنس کے نام سے مشہور ہے،

کانفرنس کے پہلے ہی اعلان نے افسردہ دلوں میں چمک اور عروق مردہ مسلم میں خون زندگی دوڑادیا جس کے نتیجہ میں مسلم عوام وخواص نے بڑی توقعات کے ساتھ جوق درجوق اس میں شرکت کی مگر جہاں تک عملی جدوجہد کا تعلق ہے تو اسکا سہرا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے سر ہے چونکہ موصوف نے پیکر خلوص وعمل بنکر اس کانفرنس کو اوج ثریا تک پہنچایا اس کانفرنس نے سہمے ہوئے مسلمانوں کو خودداری وخوداعتمادی کا ایسا سبق دیا جس نے ملک کی فضا ہی بدل کر

رکھ دی۔ لکھنؤ کے اس تاریخی اجتماع میں امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد اور مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ملک وملت کو جو رہنمائی عطا کی وہ درحقیقت برصغیر میں جمہوری زندگی کا حرف آغاز اور ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کے باوقار موقف کا سنگ بنیاد تھا،

یہ کانفرنس اصولی اور بنیادی طور پر اس بات کی ضمانت تھی کہ مسلمان فرقہ واریت جیسے بدنما داغ سے بالاتر ہیں اور ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لیکر ترقی پذیر عنصر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کیلئے آمادہ ہیں، اس کانفرنس میں ملک کو فرقہ واریت کے مہلک خطرات سے آگاہ کیا گیا مزید برآں صوبائی حکومتوں سے فرقہ واریت کا قلعہ قمع کرنے کا مطالبہ کیا گیا، کانفرنس کا اصل مقصد مسلمانوں کے دامن سے ان دھبوں کو پاک صاف کرنا تھا جو فرقہ پرستوں کی جانب سے داغے جاتے تھے،

نفس ہائے مسیح

کانفرنس کے اختتام پر جمیعۃ العلماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کی کارگذاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ایسی معرکۃ الآراء اور تاریخی تقریر کی جو افسردہ دلوں کے لئے مرغ چمن، مردہ ضمیروں کے لئے حرارت نفس ہائے مسیح مغلوبانِ گماں کیلئے یقینِ محکم اور اسیرانِ آرزو کیلئے عملِ پیہم ثابت ہوئی چنانچہ فرمایا،

جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں وحشت و درندگی کا لفظ بھی کافی نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہیکہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم

کر رہی ہے شیر اور بھیڑیئے جو سب سے زیادہ وحشتناک درندے مانے جاتے ہیں وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں پھاڑتے یہ حضرتِ انسان ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے ہوتے نہیں شرماتے،

عوام کی وحشت اور درندگی کا علاج حکومت کا فرض ہے لیکن اس کا کیا علاج جبکہ خود معالج اور امن کے ذمہ دار وحشت زدہ ہو جائیں آج ذبیحہ گاؤ یا ناجائز اسلحہ کا الزام لگا کر جس طرح مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ اسی وحشت زدگی کا نتیجہ ہے،

جمہوریہ ہند، مساوات، یکسانیت، آزادی رائے اور آزادی ضمیر کے اصول پر قائم کیا گیا ہے کانگریس ان اصولوں کی علم بردار ہے آج یہ فرض کانگریس کا ہے کہ ان اصولوں کو ملک میں کامیاب کرنے کیلئے جان کی بازی لگا دے جس وقت مسلمانوں پر فرقہ واریت کا بھوت سوار تھا ہم نے ڈٹ کر اسکا مقابلہ کیا ہے ہم خود اپنوں سے ٹکرائے آج مسلمانوں کی فرقہ واریت ختم ہو چکی ہے آج جن سنگھ اور مہا سبھا کی فرقہ واریت ملک کو تباہ کر رہی ہے ہم نے جس طرح مسلم فرقہ واریت کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح ہم ہندو فرقہ واریت کو بھی پیروں سے مسل کر دم لیں گے، ہم ہند یونین کے رگ وریشہ کو فرقہ واریت سے پاک کر کے دم لیں گے ورنہ اس کوشش میں ختم ہو جائیں گے

ع یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

مجاہدِ ملت نے مسلمانوں کو متوجہ کرتے ہوتے فرمایا،

یہ کیا بزدلی ہے کہ تم در و دیوار سے وحشت زدہ ہو تم خود اپنے سائے سے ڈر رہے ہو اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج بزدل کیوں ہو گئے اسلام اور بزدلی

ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل نہیں ہو سکتا مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے مسلمان ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا، خوف وہراس، بزدلی اور نامردی کو دل سے نکال دو یہاں سے یہ عہد کر کے جاؤ کہ ہر ایک ناانصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے بیشک ہم وفادار رہیں مگر ہم مادرِ وطن کے وفادار رہیں وفاداری کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ ہم کسی کلکٹر یا کسی سرکاری افسر یا کسی وزیر کے فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چاپلوسی اور وفاداری ہوا کرتی تھی، حکومت وزرائے حکومت اور افسران حکومت کا پہلا فرض ہے کہ وہ ملک اور وطن کے وفادار ہوں اگر ہم وفاداری کے خلاف کوئی حرکت دیکھیں گے تو یقیناً مقابلہ کریں گے کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو اور کسی ایسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو جو ہندو مسلمانوں کے لئے مشترک ہو، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فرقہ وارانہ سیاسی پلیٹ فارم غلط ہے اس غلطی کو ختم کرو اور مشترک پلیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لیکر ملک کی ترقی پذیر جماعت کی طاقت بڑھاؤ، ہمت بلند رکھو خدمت وطن کے سچے جذبے کیساتھ آگے بڑھو تمہیں انصاف اور حق وصداقت کا سر بلند کرنا ہے اگر تم نیک مقاصد کے لئے ڈٹ گئے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہو گی

حیدرآباد میں پولیس ایکشن

ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں جس وقت پولیس ایکشن ہوا تو ہر طرف سے وحشت ناک خبریں اور شدید حملوں کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا، مسلم خون ارزاں زندگی سستی تھی دشمن کی شمشیر بے نیام تھی مسلمانوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا دوستوں نے ترکِ وطن کرلیا تھا دشمن پناہ دینے کو تیار نہ تھا ایسے پرآشوب دور میں بھی مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے والی ذات حفظ الرحمن ہی کی تھی، چناں چہ مجاہد ملت نے ان دردناک حادثات سے مضطرب ہوکر دسمبر ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کیلئے جمعیۃ العلماء کا سب سے پہلا وفد روانہ کیا جس میں مولانا عبداللہ مصری اور پنڈت سندرلال شریک تھے ان حضرات نے حیدرآباد کا دورہ کرکے اپنے مشاہدات کی پوری تفصیل مجاہد ملت کے توسط سے پنڈت نہرو مولانا آزاد اور سردار پٹیل کے سامنے رکھی، دوسرا وفد ۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو روانہ کیا جس میں مولانا بشیر احمد (بھٹہ) مولانا نورالدین بہاری مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر سید محمد جعفری شریک تھے، تیسرا وفد مولانا محمد اسماعیل سنبھلی اور مقبول جاگی پر مشتمل فروری ۱۹۴۹ء میں روانہ کیا گیا،

ان وفود نے ریاست حیدرآباد کا دورہ کیا اور بچشم خود حالات وواقعات کا جائزہ لیا نیز سہمے ہوئے مسلم وغیرمسلم سب ہی کی دلجوئی کی اور دہلی واپس

اگر اصلاحِ حال کیلئے جدو جہد شروع کی، ان ہی دنوں حیدرآباد میں جمعیۃ العلماء کی داغ بیل پڑی، ان وفود نے اس وقت کے پیش آمدہ دسیوں وقتی مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ خوف زدہ مسلمانوں میں اطمینان پیدا کیا غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے نادار مظلوموں کی امداد کی اور پولیس ایکشن میں کام آجانے والوں کے لاوارث پسماندگان اور یتیموں و بیواؤں کی نگہداشت کی، مولانا مرحوم کی سرپرستی میں یہ کوشش برابر جاری رہی حتیٰ کہ حالات آہستہ آہستہ سازگار ہوتے گئے پھر موصوف نے ۹ر اکتوبر ۱۹۴۹ء کو خود حیدرآباد کا دورہ کیا اور مسلسل دس روز تک وہاں کے حالات کا جائزہ لیتے رہے جسکے نتیجہ میں وہاں کے لوگ آپ کے عقیدت مند ہو گئے مسلمانانِ حیدرآباد نے عقیدت کا اظہار اس طرح کیا کہ بڑی گرم جوشی کیساتھ مجاہدِ ملت کو دعوت دی کہ جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس حیدرآباد میں بلائیں موصوف نے انکی دعوت کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے ۲۷ تا ۲۹ر اپریل ۱۹۵۱ء کو اس اجلاس کا انعقاد کیا جو اپنی شان و شوکت اور عظیم اجتماع کے اعتبار سے مجاہدِ ملت کے ساتھ مسلمانانِ حیدرآباد کی بے پناہ عقیدت اور خلوص کا ایک لازوال ثبوت تھا،

فسادزدہ لوگوں کی آبادکاری

۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں کی وجہ سے دہلی، پنجاب، بھرت پور، اجمیر وغیرہ کے لاکھوں مسلمان جو منتشر ہو گئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو ہندوستان میں ہی کسی محفوظ مقام میں منتقل ہو گئے اور کچھ ایسے کہ جب کوئی راہ نہ

نہ پاسکے تو بادلِ ناخواستہ پاکستان کا رخ کرلیا، اور جب سنگین حالات میں سدھار کی کرنیں چمکیں تو وہ وطنِ عزیز لوٹنے کیلیئے بے قرار ہونے لگے، گاندھی جی کا کہنا بھی یہی تھا کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو واپسی کا موقع ملنا چاہیئے، حکومت ہند کی پالیسی بھی یہی تھی، لیکن چونکہ صورتِ حال کچھ ایسی بن چکی تھی کہ پاکستان سے لوٹنے والے پناہ گزینوں کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا، اسلیئے اسکو عملی تشکیل نہ دی جاسکی مگر اسکے باوجود گاندھی جی کے ہمنشینوں اور خاص طور پر وطنِ عزیز کے دور میں وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے یہ عزم مصمم کرلیا کہ تارکینِ وطن کو ازسرِ نو بسانے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیئے،

اس دوران منتشر شدہ مسلمانوں کی واپسی شروع ہوگئی جو ملک میں ہی کسی محفوظ مقام میں منتقل ہوگئے تھے ان میں بڑی تعداد میوات کے قرب وجوار اور الور، بھرت پور کے رہنے والوں کی تھی اوّل نمبر پر ان ہی کی آبادکاری کی جدو جہد شروع ہوئی جس میں شری ونوبا بھاوے، سیتم اور ایک نیک نہاد خاتون مِس مردولا سارابھائی نے اچھا رول ادا کیا اور حضرت مولانا حفظ الرّحمن صاحب سیوہاروی، مولانا سعید احمد، مولانا القاری اللہ پانی پتی وغیرہ حضرات نے اسکا بیڑہ اٹھایا،

تارکینِ وطن کی واپسی

تحریکِ پاکستان کے نتیجہ میں جن حالات سے ہندوستانی مسلمانوں کا سامنا ہوا وہ تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے جس کو دیکھ کر چنگیز اور ہلاکو خاں کی بربریت بھی شرما جاتی ہے رات دن کے دنگا فساد اور فرقہ پرستی کے

زور سے مجبور ہو کر ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت اپنے وطنِ عزیز آنے کیلئے پریشان تھی ان ہنگامی حالات میں سینکڑوں خاندان ایسے تھے جن کی نابالغ اولاد دوسرے رشتہ داروں کیساتھ پاکستان پہونچ گئی تھی مگر انکے والدین ہندوستان سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے یا ضعیف ماں باپ پاکستان ہجرت کر گئے اور جوان اولاد یہاں رہ گئی، نیز جولائی ۱۹۴۸ء سے ہندوستان پاکستان کے درمیان آزادانہ آمدورفت پر پرمٹ سسٹم کی پابندی عائد ہو گئی تھی جسکی جگہ بعد میں پاسپورٹ نے لے لی جس کی وجہ سے ہندوستان واپس آنے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا،

مجاہدِ ملت نے مولانا آزاد اور محترم پنڈت نہرو کے توسط سے یہ قانون پاس کرا لیا کہ ہندوستان کے مسلمان شہریوں کا یہ حق ہے کہ انکی نابالغ اولاد، بیوی بچے نیز خاص خاص صورتوں میں ضعیف ماں باپ اور بے وسیلہ بہن بھائی. جو کسی وجہ سے پاکستان چلے گئے ہیں انکو شہریت ملنی چاہیئے اس قانون کے تحت پاکستان سے واپس ہونے والے بہت سے افراد کی فرداً فرداً پیروی مجاہدِ ملت نے فرمائی چناں چہ آج ہندوستان میں بہت سے ایسے گھرانے موجود ہیں جنکو ازسرِ نو بسانے کا سہرا حرف اور حرف اس عظیم مجاہد کے سر ہے،

بدنما داغ ۴۷ء کے دردناک فسادمیں جہاں کشت وخوں، لوٹ مار، غارت گری، فتنہ وفساد ہوئے وہیں وسیع پیمانہ پر مجبورونا تواں خواتین کا اغوا بھی ہوا یہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی شرمناک حرکت اور بدنما داغ ہے جس سے شرافت کی نگاہ نیچی اور انسانیت کا سر جھک جاتا ہے، چنانچہ حکومتِ ہند کے سربراہ حضرات نے

اس بدنما داغ کو دھونے کیلئے اغوا شدہ خواتین کی جستجو کی راہ پیدا کی اور قومی کارندوں نے اسکو پایہ تکمیل تک پہونچایا، ہندوستان میں خاص کر دہلی، پنجاب، بھرت پور کے علاقے سے، بہت سی معصوم عورتیں گڈنیپ ہوئی تھیں جب بازیابی کی تحریک شروع ہوئی تو اس میدان میں عورتوں نے مردوں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اگرچہ دوسرے کارکنوں نے انکو طاقتِ بہم پہونچائی، اونچی سطح پر نگراں اور مشیران کار میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، سیوہاروی بھی شامل تھے، یہ کوشش مسلسل پانچ چھ سال تک رہی جس میں مغویہ خواتین کی ایک بڑی تعداد برآمد کر کے انکے متعلقین تک پہنچائی جاسکی،

مرتدین کا اعلانِ اسلام

یہی زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ۱۹۴۷ء کے طوفان کی زد میں آگئی اور اسکے علاوہ اپنے لئے کوئی راہ نہ پاسکی کہ نا چاہتے ہوئے بھی دوسرے مذاہب اختیار کر لے جب حالات بحال ہوئے تو کچھ لوگوں نے دہلی پہونچ کر مجاہدِ ملت سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم جیسے نہ جانے کتنے بھائی ہیں جنھوں نے ارتداد کی آڑ میں اپنی جانیں بچا رکھیں ہیں اور اس حسرت و یاس میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ اگر حکومت انکی پشت پناہی کرے تو وہ اپنے مذہب کا کھل کر اعلان کریں مولانا موصوف نے یہ معاملہ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو تک پہونچایا جسکے نتیجے میں ساری ریاستی حکومتوں کے نام یہ ہدایات جاری ہوئیں کہ حکومتِ ہند ایسی جبری مذہبی تبدیلی کو تسلیم نہیں کرتی اسلئے جس جس جگہ ایسے واقعات درپیش ہوں وہاں کے لوگوں

سرکاری طور پر پوری پوری مدد ملنی چاہیئے تاکہ وہ اپنے مذہب پر کھل کر عمل پیرا ہوں،

ہندوستان کی سیہ بختی کی طویل تاریخ

کاش ہندوستان کی سیہ بختی کی یہ تاریخ یہیں ختم ہو جائی تو مزید اسکا ورق غارت گری جیسے فسادات سے نہ رنگا جاتا مگر حیف صد حیف کہ ۴۷ء کے بعد بھی یہ زور افزوں فسادات پروان چڑھتے گئے اور مجاہد ملت بڑی پامردی سے انکا مقابلہ کرتے رہے چناں چہ ۵۰ء سے لیکر ۶۲ء تک کا دور بھی موصوف کیلئے کڑی آزمائش کا دور تھا آئے دن فسادات کی خبریں ملتی رہیں جہاں کہیں بھی ہنگامہ ہوتا، یا تو موصوف خود پہنچتے یا اپنے رفقائے کار کو دورہ کراتے،

۱۹۵۰ء میں ہولی کے موقع پر مرادآباد، پیلی بھیت، علی گڑھ شاہ جہاں پور کے علاوہ کلکتہ اور اسکے اطراف میں شرمناک حادثات ہوئے یوپی کے مغربی اضلاع کی اصلاح کیلئے مجاہد ملت نے انیس الحسن مولانا فقیہ الدین، مسٹر خلیل باغ والا، اور مولوی شفیق احمد دہلوی کو بھیجا اور خود پہلے ۵ مارچ ۵۰ء کو کلکتہ کیلئے روانہ ہوئے حالات کی سنگینی کی وجہ سے مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو بھی وہاں پہنچ چکے تھے مولانا حفظ الرحمن صاحب نے نہرو جی کے ہمراہ فساد زدہ علاقوں کا گشت کیا اور مصیبت زدہ لوگوں کو ڈھارس بندھائی، بعد ازاں ۱۲ مارچ کو لکھنؤ پہنچ کر وزیر اعلیٰ شری بہادر لال شاستری سے یوپی کے ہنگاموں کے بارے میں

مفصل بات چیت کی اور واپسی میں شاہجہاں پور، پیلی بھیت کا دورہ کرتے ہوئے دہلی لوٹے، ۲۷؍ اکتوبر ستمبر ۵۰ء کو چلمل ضلع بھاگلپور میں بد امنی پھیلی تو مولانا نے حضرت مولانا محمد میاں، حضرت مولانا نور الدین بہاری کو بصورت وفد بھاگلپور کیلئے روانہ کیا اسکے علاوہ بھی متعدد جگہ ہنگامہ ہوتے جہاں مولانا یا تو خود گئے یا وفد بنا کر بھیجے،

۵۱ء ۱۳؍ جنوری کو کمار دھوبی ضلع دھنباد میں فساد ہوا تو پہلے تار بھیج کر چیف منسٹر کو توجہ دلائی پھر ۹؍ فروری کو خود تشریف لے گئے، اکتوبر ماہِ محرم کو بہرائچ، بارہ بنکی میں فتنہ برپا ہوا تو اسکی سرکوبی کیلئے مولانا سید محمد شاہد فاخری صاحب کو فوراً روانہ کیا، مئی کے شروع میں گجرات کے بعض علاقوں میں فساد ہوا تو مولوی رفیق احمد صاحب کو بھیجا،

۵۲ء میں جے پور، آگرہ، فیروز آباد میں خونریز ہنگامے ہوتے علاوہ ازیں مظفر نگر میں بھی حالات ناموافق رہے یہاں مولانا نے خود آکر اصلاح حال کی کوششیں فرمائیں، پھر علی گڑھ میں ہنگامہ ہوا تو وہاں کیلئے مولانا فقیہ الدین صاحب کو روانہ کیا،

۵۳ء میں یکم مارچ ہولی کے دن سے بھوپال میں شدید ہنگامے ہوئے جہاں پر مولانا محمد میاں صاحب، مسٹر یوسف فیروزی اور مولانا فقیہ الدین کو بشکلِ وفد بھیج کر اصلاح حال کی پوری پوری کوششیں فرمائیں اس سال جے پور کے ایک دیہات میں ۱۶؍ اپریل کو کچھ گڑبڑ ہوئی تو وہاں مسٹر سلطان یار خاں کو بھیجا،

۵۴ء میں پیلی بھیت، ہلدوانی متھرا، جودھپور، نظام آباد، عادل آباد اور اسکے علاوہ متعدد مقامات پر بد امنی پھیلی جہاں مولانا نے ہر ممکن طریقے سے روک تھام کی سعی پیہم کی اور جب ۲؍ ستمبر کو دہلی میں جمعیۃ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا

تو مولانا نے تمام حالات وواقعات سامنے رکھے جس کے تحت یہ طے پایا
کہ جمعیۃ کا ایک وفد محترم پنڈت نہرو سے ملے اور اقلیت کی تمام پریشانیوں
پر متنبہ کرے چناں چہ جمعیۃ کا ایک معزز وفد (جس میں مجاہدِ ملت کے علاوہ
مولانا احمد سعید، سید محمد جعفری، مولانا محمد میاں، مولانا مفتی عتیق الرحمن،
مولانا نور الدین بہاری، مولانا شاہد فاخری جیسے یگانۂ روزگار شامل تھے)
حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں وزیرِ اعظم ہند سے ملا، نہرو
جی نے وفد کی معروضات وتجاویز کو بغور سُنا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی
کی جانب سے ریاستوں کو یہ ہدایات جاری کر دی گئیں کہ فرقہ وارانہ فسادات
کی بندش، اور اقلیت کی پریشانی دفع کرنے میں خاصی دلچسپی سے کام لیں،

آزاد ہند کی شہادت

ان ہی دنوں مجاہدِ ملت کی جہد مسلسل کو دیکھتے ہوئے کلکتہ کے مشہور
روز نامہ "آزاد ہند" نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا، بڑھاپے میں آدمی کمزور
پڑ جاتا ہے دل بجھ جاتا ہے، خون میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے، کام کرنے کی نہ امنگ
باقی رہتی ہے نہ حوصلوں میں بلندی مگر ہندوستان کے دو بوڑھے ایسے ہیں
جو جوانوں کو بھی مات دیئے ہوئے ہیں ایک وزیرِ اعظم ہند پنڈت نہرو
اور دوسرے جمعیۃ العلماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا حفظ الرحمن، ان دونوں
بوڑھوں نے اس وقت ملک کو اپنے کمزور کندھوں پر جواں اور مضبوط
ہمت کے ساتھ اٹھا لیا ہے۔ یہ فرق اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک
شخص عوامی لیڈر شپ کے علاوہ سرکاری کرسی بھی سنبھالے ہوئے ہے
اور دہری محنت کر رہا ہے، مولانا حفظ الرحمن نے آج سے پندرہ برس پہلے کے

ہمت شکن ہندوستان میں جواں مردی سے عوام کی جو خدمت کی ہے وہ انکی زندگی کا ایسا ورق ہے جسے زمانے کی کسی عمر میں بھی بھلایا نہیں جاسکتا

۵۵ء ماہ ستمبر میں کوٹہ میں فساد ہوا تو مولانا نے وہاں پہونچ کر حالات کا جائزہ لیا حالات سنگین ہونے کی وجہ سے چیف منسٹر راجستھان شری سکھاڑیا سے ملے اور تمام حالات انکے سامنے رکھے جسکے نتیجہ میں کلکٹر ایس، پی، کوٹہ کا تبادلہ عمل میں آیا اور سدھار کی پوری کوششیں ہوئیں، ۱۵ر اکتوبر کو کاسگنج میں کچھ گڑبڑ ہوئی تو وہاں کیلئے مولانا فقیہ الدین اور مولانا عبد الشاہد شروانی کو روانہ کیا،

ایک شر انگیز کتاب

۵۶ء میں ۱۷ر اپریل کو جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا اچانک ٹیلی فون پر یہ خبر ملی کہ بھوپال میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے جسکی روک تھام کیلئے مولانا شاہد فاخری وغیرہ کو اگلے ہی روز روانہ کردیا اس سال "ریلجس لیڈرز" نامی کتاب نے فتنہ و فساد میں مزید چار چاند لگادیئے اور ارائی، جبل پور، کھام گاؤں، علی گڑھ، مراد آباد جگہ جگہ خونریز ہنگامے ہوئے، جبل پور وغیرہ کیلئے مسٹر عبد الستار فاروقی اور حافظ جمیل الرحمن صاحب کو روانہ کیا، علی گڈھ کیلئے مولانا فقیہ الدین، مسٹر سلطان یار خان، اور مولانا عبد الشکور ایم، پی، کو بھیجا اور مولانا خود مراد آباد گئے واپس آتے ہی پنڈت نہرو و پنڈت پنتھ اور صدر کانگریس کو حالات سے آگاہی کرائی، پنڈت نہرو پر اسکا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ۲۳ر ستمبر کو دہلی کے جلسۂ عام میں نہرو جی نے فرقہ پرستوں کی ڈٹ کر مذمت کی اور توہینِ مذاہب کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کیا،

اس سال سدھار کی ہر ممکن کوشش کی گئی جسکے نتیجے میں ۵۷ء ۵۸ء میں فتنہ کا سر دبا رہا چند مقامات پر ہلکی سی سورش ہوئی، لیکن

پھر فتنہ نے سر اٹھایا

۵۹ء میں فتنہ نے پھر سر اٹھایا چناں چہ ۹ر جنوری کو کشن گنج، (اُسوقت ضلع پورنیہ) میں وسیع پیمانے پر فساد ہوئے جس کی سرکوبی کیلئے مولانا محمد میاں صاحب، مولانا طاہر صاحب، ایم، پی، مولانا سید نور اللہ صاحب کو فوری طور پر روانہ کیا ماہِ رمضان ۲۶ر مارچ کو ہولی کے موقع پر مبارکپور بہرائچ میں بھی خونریز ہنگامے ہوئے مزید براں پولیس کے مظالم نے حالات کو سنگین تر بنا دیا جہا مولانا بنفسِ نفیس گئے اور حالات کی سنگینی دیکھ کر بے حد مغموم ہوئے دہلی واپس لوٹے ہی تھے کہ دت نگر ضلع میرٹھ سے فساد کی خبر موصول ہوئی جہاں کے لئے مولانا فقیہ الدین صاحب کو بھیجا ۲۹ر مارچ کو بھوپال میں شدید حوادث پیش آتے جہاں مولانا خود تشریف لے گئے رفیق سفر مسٹر انیس الحسن صاحب تھے ۱۷ر اپریل کو سیتا مڑھی میں بھی آگ کی چنگاری بھڑکی، ۹ر مئی کو ملک میں ہونے والے فسادات کے پیش نظر کانگریس کی ایک میٹنگ ہوئی جسمیں مولانا مرحوم اور چیف منسٹر مدھیہ پردیش ڈاکٹر کاٹجو بھی شریک ہوئے میٹنگ میں مولانا نے فرقہ پرستوں کی حرکتوں اور ان کے ساتھ اعلیٰ حکام کے مسلسل تعاون کے دلائل و شواہد پیش کئے جولائی میں سیتا مڑھی سے پے بہ پے اطلاع آنے پر ۲ر جولائی کو وہاں تشریف لے گئے،

۱۹۶۰ء ۱۲؍اگست کو جامع مسجد فیروزآباد میں سخت واردا تیں ہوئیں جہاں مجاہدِ ملت نے مولانا فقیہ الدین صاحب اور ڈاکٹر محمود قادری کو بھیجا اور خود مجاہدِ ملت وزیرِ اعظم سے ملے لیکن اٹھارہ ستمبر کو فیروزآباد میں پھر شدید ہنگامے ہوتے آگرہ میں بھی فتنہ وفساد کی آگ پھیلی دونوں جگہ مولانا بذاتِ خود تشریف لے گئے اور حالات کو بحال کرانے میں ایک حد تک کامیاب ہوتے ۱۹۶۱ء میں فتنہ وفساد نے مزید بال و پر نکال لئے تھے وقفہ وقفہ سے شدید حوادث کا حملہ ہوتا رہا طرح طرح کی پیچیدگیاں اور نئے نئے عوارض نمودار ہوتے گئے ۲۳؍جنوری سے ۸؍فروری تک مولانا بہادو آسام کی بادیہ پیمائی کر کے لوٹے تو ادھر ۶؍فروری سے جبل پور میں خونی ہنگامہ شروع ہو چکا تھا دہلی لوٹتے ہی مولانا نے چیف منسٹر ڈاکٹر کاٹجو سے ٹرنک کال پر گفتگو کی انھوں نے اطمینان دلایا کہ حالات قابو میں ہیں مگر دوسرے ہی روز ۹؍فروری کو آنے والی خبروں کے ذریعے یہ اندازہ ہوا کہ حالات قابو سے باہر ہیں مولانا نے فوراً وزیرِ اعظم ہند پنڈت نہرو کو ذاتی طور پر ایک خط لکھا جس میں اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا، اور تحقیقِ حال کیلئے مسٹر انیس الحسن او مولانا مسعود احمد صدیقی وغیرہ حضرات پر مشتمل ایک وفد روانہ کیا ہر چند کہ حالات کی سنگینی کی وجہ سے کانگریس، سوشلسٹ، کمیونسٹ پارٹیوں کے وفود بھی بعد میں وہاں پہونچے مگر جس وقت دلوں کے زخم تازہ تھے اس وقت مرہم کا کام مرکزی جمعیۃ کے وفد نے انجام دیا، جب اس وفد نے دہلی واپس آکر مجاہدِ ملت کو کارگزاری سنائی اور آتش زدہ مکانوں وبرباد شدہ دکانوں کا تذکرہ کیا تو مولانا بلبلا اٹھے ایک طرف وزیرِ اعظم ہند کو

تمام حالات وواقعات سے باخبر کیا اور دوسری جانب ہند پارلیمنٹ میں دو ایسی معرکتہ الآرا تقریریں کیں جن پر ملک کے گوشہ گوشہ سے تحسین وآفریں کی صدائیں گونجیں،

یک طرفہ بربادی

حوادث جبلپور وساگر کے بعد ۵ رمضان ۱۳۸۰ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۶۱ء کو مجاہد ملت کی پہلی تقریر ہند پارلیمنٹ میں ہوئی جس میں انھوں نے مدھیہ پردیش کے فسادات میں ایڈمنسٹریشن کی مجرمانہ چشم پوشی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا،

ایڈمنسٹریشن نے جان بوجھ کر اس میں چشم پوشی کی یا ماتحت پولس کے افراد نے ساتھ دے کر بربادی کرانے کی کوشش کی اسوقت حکام نے لوکل حکام نے ایڈمنسٹریشن نے اپنی کمزوری بھی دکھائی، اس سازش میں انکا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے بقول سیٹھ گووند داس ۳، ۴ تاریخ کو یہ واقعہ پیش آیا تھا اسکی روک تھام ہو سکتی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپیشل پولس کے جو دستے بلائے گئے تھے وہ کیوں واپس چلے گئے تھے جسکے نتیجہ میں ۷، ۸ تاریخ کی درمیانی رات کو اسقدر ہولناک بربادی ہوئی۔ جان بوجھ کر ایک سائڈ کی اس طریقے سے بربادی کرائی جائے یہ کسی طریقے سے بھی ہندوستان کے لئے زیبا نہیں ہے، ہم پاکستان کے خلاف اعتراض کریں وہ ہمارا حق ہے کوئی ہمارے معاملے میں دخل نہ دے ہم میں اتنی طاقت ہے

کہ ہم اپنے ہندوستان میں اپنے معاملے کو حل کرسکتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی لگاکر ملک کو آزاد کرایا ہے ان کو آج ان باتوں سے کوئی ڈر نہیں ہوسکتا کہ جب بھی کوئی ایسی فساد کی من مانی بات کی جائے مسلم اقلیت کی تکلیف کی بات آئے تو اخباروں یا تقریروں میں فوراً پاکستان کے حوالے دیدئے جائیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسکا پاکستان سے جوڑ تھا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طریقے سے حقیقت کو دبایا نہیں جاسکتا اور اگر اس طریقے سے حقیقت کو دبانے کی کوشش کی جائیگی تو اس سے ملک کو کوئی لابھ اور فائدہ نہیں ہوسکتا بلکہ ملک کو انتہائی نقصان ہوسکتا ہے،

فرقہ پرستی کا الزام

مجاہد ملت کی دوسری تقریر ۷ رشوال ۱۳۸۰ھ مطابق ۲۹ رمارچ ۱۹۶۱ء کو پھر ہند پارلیمنٹ میں ہوئی جس میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف اخبارات و رسائل میں فرقہ پرستی ایسے القاب کے جواب میں کہا، اس طرح کی اشتعال انگیز تحریریں مسلمانوں کے خلاف لکھنا، کیا یہ فرقہ پرستی نہیں ہے اور کیا یہ ٹھیک ہے یہ کونسا طریقہ ہے اس سے امن وامان کیا قائم رہ سکتا ہے کس طرح سے اسکا تحفظ ہوسکتا ہے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس جمعیۃ العلماء کے لاکھوں آدمیوں نے اپنی قربانیاں دے کر ہندوستان کو آزاد کرانے میں حصہ لیا سیکولرزم نیشنلسٹی قائم کرنے کیلئے جدوجہد کی سیکولرزم کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا

اور اپنا خون بہایا آج اسی کو بدنام کیا جائے اگر ایک ایسے موقع پر جب مسلمانوں کی یہ بربادی ہوئی تو اس نے دو چار آرٹکلس لکھ دیئے جس میں مسلمان بالکل ڈیمارلائز نہ ہو جائیں بے بس نہ ہو جائیں تو وہ فرقہ پرستی ہے اور صبح سے شام تک جو آگ ان کے خلاف برسائی جائے اسے کوئی فرقہ پرستی نہیں کہتا،

ے ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سچ کہا ہے کسی شاعر نے

ے جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

کل ہند مسلم کنونشن پر ایک نظر

آزادی کے بعد فتنہ و فساد کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ سال دو سال سے نہیں بلکہ مسلسل تیرہ برس سے چلا آرہا تھا اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید یہ سلسلہ یوں ہی پروان چڑھتا رہے گا مجاہد ملت جو روزِ اول سے ہی اسکے مٹانے کے درپے رہے ہیں، انکو اس بات کی تشویش ہوئی کہ اگر ہندوستان کی عظیم الشان اقلیت پر اسکی گرفت اسی طرح مضبوط ہوتی رہی اور اسکے اسباب و عوامل یوں ہی قائم رہے تو مسلم اقلیت کیلئے موت کا پیغام ثابت ہوگا فرقہ پرستی اس حد تک عام ہو چکی تھی کہ سرکاری عملہ بھی اسکی رو میں بہہ رہا تھا نیز فرقہ پرستی نے صرف فسادات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سماجی، سیاسی، کاروباری غرض زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر ڈالا، مجاہدِ ملت کی نگاہ میں تیرہ سال کی پوری سرگذشت تھی اور وہ آنے والے خطرات کو بھی پوری طرح محسوس کر رہے تھے، چناں چہ اپریل ۱۹۶۱ء میں جب مجلسِ عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے سامنے مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو جہاں اور بہت سی چیزیں طے پائیں وہیں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ بہت جلد پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ کنونشن بلایا جائے اور ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کی فتنہ سامانیوں کا کوئی موثر حل تلاش کیا جائے، پیش نظر رہے کہ چند ماہ تک جمعیۃ العلماء اس مسئلہ پر غور کرتی رہی کہ مسلمانوں اور صاف دماغ سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے ہندو رہنماؤں کا کنونشن کیا جائے اور پھر مشترک نمائندگی کے ذریعہ حکومت کو صورتِ حال پر متنبہ کیا جائے لیکن کچھ دشواریاں اس مشترک نمائندگی کی راہ میں سنگ گراں بنی رہیں

کیوں کہ ان ہندو رہنماؤں کو اس بات کا علم تک بھی نہیں کہ مسلمان کن حالات سے دوچار ہو رہے ہیں اسلئے کہ انکی معلومات کا ذریعہ اخبارات ہی ہوا کرتے ہیں اور وہ اس بات پر کمر بستہ ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کے مصائب کا تذکرہ بھی نہیں کریں گے البتہ اردو کا پریس مسلمانوں کے مصائب کا شکوہ ضرور کرتا تھا مگر سوئے قسمت کہ غیر مسلم تو کیا مسلمان بھی اردو اخبار پڑھنا گوارہ نہ کرتے تھے آخر کار یہی فیصلہ ہوا کہ کل ہند مسلم کنونشن کیا جائے، اس تجویز کے بعد مجاہدِ ملت نے اخبارات کے ذریعہ کنونشن کا اعلان کر دیا اور تیاریوں میں مشغول ہو گئے لیکن اس اعلان نے ملک میں تنقید کا ایک نیا موضوع پیدا کر دیا فرقہ پرست افراد وجماعتوں کا اختلاف تو یقینی تھا مگر ان دوستوں کا رویہ بھی بدل گیا جو کنونشن کیلئے مصر تھے، اخبارات نے بھی خوب جم کر کیچڑ اچھالا اور اس کو بے محل اقدام قرار دیا، اسی پر بس نہیں بلکہ پنڈت نہرو کے سامنے اس مسئلہ کو اس قدر سنگین بنا کر پیش کیا گیا کہ وہ بھی مخالفین کی صف میں آ گئے مگر قربان جایئے مجاہدِ ملت کی ذات پر کہ ان تمام شورشوں کے باوجود انکے ارادے میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی اگرچہ فکر واضطراب میں قدرے اضافہ ضرور ہوا گویا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے،

ے میں وقت کی تنقید سے مرعوب نہیں
تنقید نے اے دوست سنوارا ہے مجھے
دنیا کے سہاروں کا میں قائل ہی نہیں
اللہ کی رحمت کا سہارا ہے مجھے

بہر حال مجاہدِ ملت نے عزم واستقلال کے ساتھ خوبی تدبیر سے بھی کام لیا اور اپنی ہر دلعزیزی کی سند کے سبب ہر مخالف کو اپنا گرویدہ بنا لیا

صدر کانگریس اور پنڈت نہرو کو بھی اپنی رائے سے رجوع کرکے کہنا پڑا کہ مسلم کنونشن سے جمہوریت اور قومی یکجہتی کو تقویت پہنچے گی،

۲۲ر مئی ۱۹۶۱ء کو دہلی سے کنونشن کا دعوت نامہ جاری کیا گیا جسمیں لکھا تھا

پیغام

جناب محترم!

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وطنِ عزیز کی آزادی اور ملک میں سیکولر جمہوری دستور کے نفاذ سے لیکر آج تک مسلمانانِ ہند زندگی کے تقریباً تمام اہم شعبوں میں اپنے جائز حقوق سے بڑی حد تک محروم رہے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں جماعتی اور انفرادی مسلسل جد وجہد کے باوجود جو ریاستی و مرکزی لیجسلیچرز کے اندر اور باہر جاری رہی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی ہے،

یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کیلئے انتہائی ہمت شکن اور شدید اضطراب کا باعث ہے بلکہ خود ملک و قوم کی سالمیت، استحکام، وقار اور ترقی کی راہ میں بھی زبردست رکاوٹ ہے اسلئے شدید ضرورت ہے کہ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے ارباب فکر و عمل اپنے اپنے جماعتی اختلاف و نقطہائے نظر سے بالاتر ہو کر وحدتِ فکر و عمل کے تعمیری جذبہ کیساتھ ایک جگہ جمع ہوں اور مسطورۂ ذیل بنیادی امور پر متحد و متفق ہو کر غور کریں اور کوئی موثر راہِ عمل تلاش کریں،

(۱) ایسے طریقوں اور تدبیروں پر غور کرنا جن سے ملک کے تمام باشندوں کے درمیان اپنے اپنے مذہب اور کلچر پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوتے باہمی اتفاق و اتحاد میں ترقی ہو تاکہ ملک کی ہر جہتی ترقی اور استحکام کو زیادہ سے زیادہ تقویت حاصل ہو،

(۲) مسلم اقلیت آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں جن بھیانک جانی ومالی بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے انکے انسداد کے موثر وسائل وذرائع معلوم کرنے کے لئے غور وفکر

(۳) ایسی تجاویز جن کے بروئے کار لانے سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں اپنا واجبی حصہ پا سکیں اور لیجسلیچر زمیں ان کو حق کے مطابق نمائندگی حاصل ہو سکے

(۴) وہ تدابیر وسائل جنکو اختیار کر کے مسلمان تجارت اور معاش کے دیگر ذرائع مثلاً پرمٹوں، ٹھیکوں وغیرہ میں عملی طور پر اپنے حق کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں،

(۵) اردو زبان سے متعلق ابھی تک اصل دستوری مطالبہ پورا نہیں ہو سکا ہے اگرچہ انجمن ترقی اردو کی مشترکہ جد جہد جاری ہے تاہم اس مسئلہ سے متعلق ایسی تدابیر کی تلاش جن سے اردو کو اسکا اصلی مقام حاصل ہو سکے اور ہماری ملی جلی تہذیبی زندگی کا حسن برقرار رہ سکے،

(۶) سرکاری نصاب تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں آئے دن ایسے اجزار کی شمولیت جو اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابل برداشت اور وجہ اعتراض ہیں ان شکایات کے ازالہ کیلئے مؤثر واطمینان بخش تجاویز،

(۷) عام تعلیمی اداروں بالخصوص میڈیکل اور میکنیکل تعلیم کے اداروں میں داخلے اور سرکاری وظائف کے حصول میں معیاری قابلیت کے باوجود مسلم طلبار کو امتیازی سلوک اور ناانصافی کی عام شکایت ہے۔ اسکے تدارک کیلئے ضروری تدابیر

مسلم کنونشن کسل مندوں کیلئے بانگِ درا

۱۰ر ۱۱ر جون ۱۹۶۱ء کو سپر ہاؤس نئی دہلی میں جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم، پی، کی صدارت اور مجاہدِ ملت کے اہتمام میں مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اس مسلم کنونشن کا انعقاد ہوا، بلاتامل کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ۱۸۵۷ء کی قیامتِ صغریٰ کے بعد "لکھنؤ کانفرنس" نے مسلمانوں کو سینہ تان کر چلنے کے قابل بنادیا تھا اور تاریخ کا دھارا جو غیروں کی سمت بہہ رہا تھا اسکا رخ موڑ دیا تھا ٹھیک اسی طرح مجاہد ملت کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ "مسلم کنونشن" ملک وملت کی تاریخ کا ایک دور آفریں واقعہ تھا جس نے نہ صرف مقفل دل و دماغ کی دنیا بدلی بلکہ کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کیا اور خشک رگوں میں خونِ زندگی دوڑایا،

مسلم کنونشن جس طرح مسلمانوں کیلئے پیغام تھا کہ جبل پور اور ساگر جیسے مہلک اور جاں گسل حوادث کے باوجود بزدلی اور پست ہمتی حرام ہے بے شک وہ مظلوم ہیں، مظالم کا شکوہ اور مظلومیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر طوقِ غلامی کیلئے اپنی گردن خم نہیں کر سکتے، اسی طرح وہ پورے ہندیونین اور اسکے سیکولر نظام کیلئے ایک پیغام تھا کہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسکا ہر عضو زندہ ہو اور وہ حیاتِ نو کی امنگوں کیساتھ متحرک بن سکے، وہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے نصب العین کیلئے بھی

ایک نشان تھا کہ گلہائے رنگارنگ کو شاداب رکھ کر ہی گلدستہ کی شیرازہ بندی ہوسکتی ہے، مرجھائے ہوئے پھولوں کی گڈی کو گلدستہ نہیں کہا جاسکتا،

بین الاقوامی دنیا کے گلدان میں اگر آپ اپنا گلدستہ سجانا چاہتے ہیں تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہر پھول شگفتہ اور ہر کلی مسکراتی ہوئی ہو مرجھائے پھولوں کا گلدستہ گلدان میں نہیں سجایا جاسکتا بلکہ خس وخاشاک کی طرح اسکو کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے

مجاہد ملت کا الوداعی پیغام

اس کنونشن کے صدر استقبالیہ خود مجاہدِ ملت تھے موصوف نے اس موقع پر جو خطبہ استقبالیہ پیش کیا وہ انکے افکار وعزائم کی ایک روشن تصویر، اور ملک ملت کے نام اس جانباز مجاہد کا آخری پیغام تھا مجاہدِ ملت کے آخری پیغام سے ان صفحات کو مزین کرنا چاہتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے!

حاضرین محترم! اس اجتماع میں شرکت کیلئے جو دعوت نامہ آپکی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اس پر داعی کی حیثیت سے متعدد معزز حضرات کے نام درج ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اجتماع کے داعی صرف یہی حضرات نہیں بلکہ یہ دعوت ان کروڑوں انسانوں کے دلوں کی آواز ہے جو اس عظیم ملک کے شہری ہوتے ہوتے اور ایک جمہوری دستور کے سایہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو زندگی کی راہوں میں پامال اور قدم قدم پر اپنے آپکو جائز حقوق سے محروم پارہے ہیں اور اس صورتِ حال کے تسلسل نے ان کے اس اضطراب کو اپنی انتہا تک پہنچادیا ہے کہ کسی طرح ملک وملت کے سربراہ جمع ہوں اور انکے درد کا کوئی علاج اور انکے اضطراب ومشکلات کا کوئی حل تلاش کریں تاکہ

کسی صورت، انکی زندگی بھی سکون واطمینان سے آشنا ہو سکے،

حضرات محترم! یہ وسیع اور عظیم الشان ملک جو ہمارا وطنِ عزیز ہے صدیوں سے مختلف فرقوں اور ملتوں کا گہوارہ اور مختلف زبانوں وعقائد اور اصولوں کا سنگم رہا ہے وطنیت کے لازوال رشتہ نے اس ملک کی وسیع آبادیوں کو زبان تہذیب اور رسم ورواج کے تمام اختلاف کے باوجود ہمیشہ ایک اکائی بنائے رکھا ہے یہی وحدت واتحاد باہمی تعلقات کی خوشگواری اور تعاون درحقیقت اس ملک کی سب سے بڑی قوت اور اسکے استحکام اور ترقی کی بنیاد ہے یہی وحدت وہ عظیم طاقت تھی جس کے بل پر ہم نے برطانوی اقتدار سے نجات پائی اور ملک کو آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔ افسوس کہ ملک کی تقسیم نے ہماری اس بے پناہ طاقت کو کمزور کیا اور ہمارے اندر خود پرستی، فرقہ پرستی، تنگ دلی وتنگ نظری کے وہ شگاف پیدا کیئے جن سے ہماری وحدت کا شیرازہ بکھرا اور دنیا نے ہمارے انتشار کا تماشہ دیکھا تقسیم وطن کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جو حوادث پیش آئے آج انکی یاد بھی شریف اور سنجیدہ انسانوں کی نگاہیں شرم وندامت سے جھکا دیتی ہیں، وہ سب کچھ تنگ دلی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کا ایک وقتی بخار یا ایک ہنگامی سیلاب تھا جو اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ ملک کے ایک سرے سے اٹھا اور دوسرے سرے تک گذرتا چلا گیا آپکو یاد ہوگا کہ اس وقت بھی جمعیۃ علماء ہند نے ملک کو مہلک اثرات سے پاک وصاف کرنے کے لئے مرحوم ومغفور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی راہ نمائی میں پورے ملک کے اصحاب فکر اور تدبر کی ایک عظیم کانفرنس "مسلم آزاد کانفرنس" کے نام سے لکھنؤ میں بلائی تھی جس نے ملک بھر میں ایک نئی فضاء اور مفید نتائج

پیدا کئے ، کاش کہ وہ صورت حال اس وقت کے ساتھ ختم ہو گئی ہوتی مگر افسوس
کہ اسکے بعد سے اب تک ۱۳ رسال کا جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے وہ اس حقیقت
کی برملا شہادت ہے کہ تنگ نظری ، فرقہ واریت اور جارحانہ حد بندیوں کے مہلک
جذبات اس پورے عرصہ میں کار فرما رہے ہیں ، پچھلے کچھ عرصہ میں زبان کے
نام پر گجرات ، مہاراشٹر اور آسام و بنگال میں اور مذہب کے نام پر یوپی
بہار ، اور مدھیہ پردیش وغیرہ کے مختلف شہروں اور دیہاتوں بالخصوص
جبل پور اور ساگر میں جو کچھ ہوا اسکے بعد شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی
کہ اس صورت حال میں نہ صرف یہ کہ اختلاف زبان و مذہب کے نام پر
لاکھوں باشندگانِ ملک کیلئے زندگی اجیرن بن رہی ہے بلکہ اس طرح خود
ملک کی صحت و سالمیت بھی پنپ نہیں سکتی ،

پھر جو طبقہ اس فرقہ واریت ، تنگ نظری اور مسموم جذبات کا سب سے
زیادہ تختۂ مشق بنا ہے وہ اس ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت یعنی
مسلمان ہیں جنکو جمہوری دستور کے مطابق مساویانہ حقوق کے دلانے میں
خود اکثریت کے شریف اور سنجیدہ اصحابِ فکر و نظر کی مسلسل کوششیں بھی
ابھی تک بار آور نہیں ہو سکیں ،

مسلم اقلیت کے خلاف یہ جارحانہ فرقہ واریت اور معاندانہ جذبات
صرف عوامی زندگی میں ہی اثر انداز نہیں بلکہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت
کے دائروں میں بھی اس کی چھاپ بہت گہری ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جا بجا
مسلم اقلیت آئے دن ایک شر پسند گروہ کے ہاتھوں جان و مال و عزت و
آبرو کی یک طرفہ بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے پھر تماشہ یہ ہے کہ فرقہ
وارانہ جارحیت اور غنڈہ گردی کی ان وارداتوں کو ہندو مسلم فساد کہکر

حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ واقعتاً (جیسا کہ میں نے ہند پارلیمنٹ میں بھی اور اسکے باہر بھی بار بار کہا ہے) ان واقعات کو ہندو مسلم فساد کہنا ہندو اور مسلمانوں دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے کھلی ہوئی توہین اور حقیقت کی غلط تعبیر ہے ملک کے عوام ہندو اور مسلمان عام طور پر فرقہ پرست عناصر کی ان حرکتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں باہم یکجہتی کے رجحان ابھر رہے ہیں، درحقیقت غنڈہ گردی کی یہ تمام واردا تیں اسی مسموم ذہنیت کی ابھاری ہوئی اسکیمیں ہوتی ہیں جو مختلف بہانوں اور تدبیروں کے ساتھ بروئے کار لائی جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر مقامی ایڈمنسٹریشن کا تعاون اور پشت پناہی انکو حاصل ہوتی ہے،

ایک طرف ہماری شہری زندگی میں ان حوادث کا تسلسل اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں، نصاب کی کتابوں، صنعت و حرفت کے مرکزوں، تجارت کے وسائل اور کاروباری میدانوں تک میں مسلم اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک، حق تلفی اور ویرانی نیز مجالسِ قانون ساز میں ناکافی نمائندگی کی شکایتوں نے جو افسوسناک شکل اختیار کرلی ہے اور پچھلے تیرہ سال کی سرگذشت نے اسکا جو ریکارڈ بنایا ہے اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں آج اسکی تفصیلات کو دہرانا سراسر غیر ضروری ہے،

یہ تشویشناک صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلم اقلیت کے لئے اضطراب کا باعث ہے بلکہ ساتھ ہی ملکی صحت و سالمیت کیلئے بھی کینسر سے زیادہ خطرناک اور تعمیر و ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آج خود اکثریتی طبقہ کے وہ تمام نیک و نہاد افراد جو اس ذہنی گراوٹ اور تنگ دلی سے بالاتر ہو کر معاملات کو دیکھتے، سوچتے اور سمجھتے ہیں

اس صورتِ حال سے اسی قدر نالاں و پریشان ہیں جس قدر خود مسلم اقلیت بے چین و مضطرب ہے، انھیں بھی یقین ہے کہ اختلاف مذہب و مسلک کے نام پر ملک کی اتنی بڑی آبادی کو پامال اور برباد کرنے کی کوشش پورے ملک کیلئے خودکشی کے مترادف ہے، چناں چہ آج بیرونی خطرات سے پہلے جو اندرونی وطنِ عزیز کے امن و استحکام کو چیلنج کر رہا ہے وہ یہی مسموم ذہنیت اور فرقہ پرستی کے مہلک جذبات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح آج ہم وطنِ عزیز کے مستقبل میں سچی جمہوری اور قومی یکجہتی کار فرما دیکھنے کیلئے مضطرب ہیں اور اسی جذبہ کے ساتھ آج ہم یہاں سر جوڑ کر بیٹھے ہیں، اسی طرح بلا لحاظ مذہب و ملت اور تمام اصحاب فکر و تدبیر جن میں خود ملک کے وزیر اعظم (پرائم منسٹری) کی شخصیت بھی شامل ہے اس سنگین صورت حال سے بہت متاثر اور فکر مند ہیں اور پوری اہمیت کے ساتھ اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ کیونکر جذبات کے اس غلط بہاؤ کو روکا جائے اور ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی (نیشنل اینٹی گریشن) کو برقرار رکھنے کیلئے ایڈمنسٹریشن اور عوام کے دائروں میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں،

یقیناً ملک کے سچے رہنماؤں کی یہ توجہ تحسین و تصویب کی مستحق ہے اور ہماری آرزو ہے کہ ان کی کوششیں عملی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کر سکیں!

سامعین کرام! آج ہی نہیں بلکہ آج سے بارہ سال پہلے بھی اس خطرات و نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے ملک کے تمام دور اندیش رہنماؤں نے دستور ساز اسمبلی میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس عظیم ملک کی فلاح و ترقی کے تمام نقشے سیکولرازم اور جمہوریت کی بنیاد پر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں اسی لئے انھوں نے ملک کے لئے وہ بہترین دستور (کانسٹی ٹیوشن) مرتب کیا جس کا بنیادی تصور

کہ اپنی کوشش اور جستجو میں ہم تنہا نہیں بلکہ ایک خاص عنصر کو چھوڑ کر جو فرقہ پرستی، تنگ نظری یا تنگ دلی کی تاریکیوں میں بہت دور ہو چکا ہے اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں کھو چکا ہے اس عنصر کے علاوہ اس ملک کے سب ہی سنجیدہ اور شریف انسان (خواہ وہ کوئی بھی مذہب و مسلک رکھتے ہوں) ہمارے ساتھ ہیں ہماری پریشانیوں اور اضطراب کا انھیں بھی احساس ہے سیکولرازم اور جمہوریت کی پامالی سے وہ بھی نالاں ہیں،

ان ہی احساسات و عزائم کے ساتھ آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں کہ پوری سنجیدگی، احتیاط اور سچے قومی و تعمیری جذبہ کے ساتھ ان مسائل و معاملات پر غور کریں جو ایجنڈے کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں ہمیں اسوقت اسکا بھی پورا احساس ہے کہ نامساعدت حالات میں یہ ایک نہایت اہم اور نزاکتوں سے بھرپور کام ہے، جس کا بیڑہ ہم نے اٹھایا ہے خدا کرے کہ ہم اس ذمہ داری کو بخوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکیں اور ہمارا یہ جرأت مندانہ اقدام ملک و ملت کی راہ میں مفید اور کامیاب اقدام ثابت ہو،

مسلمانوں سے گذارش

حضرات محترم! مسلمانان ہند کے اس عظیم نمائندہ اجتماع کے موقع پر جو خصوصیت سے مسلم اقلیت کے ایک عام اور مسلسل اضطراب کے لئے یہاں منعقد ہو رہا ہے بے جا نہ ہو گا کہ خود مسلمانانِ ہند کی خدمت میں بھی گذارش کروں کہ وہ اپنی اس پر آشوب زندگی میں ظاہری تدابیر و مسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ اپنے اندر اعتماد علی اللہ اور صبر و استقلال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں پیدا کریں، اسوۂ رسولِ کریم

علیہ الصلوۃ والتسلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ تکالیف و مصائب کے طوفانوں سے گذر کر بھی وہ احساس کہتری، پامالی اور مایوسی کا شکار نہوں اور انکے اس یقین میں کوئی تزلزل نہ آئے کہ اپنی وطنی زندگی میں ہمیں جو بھی حوادث اور مشکلات درپیش ہیں وہ بہر حال وقتی اور دنیوی مصائب ہیں اور ہمارا حقیقی اعتماد کارساز حقیقی کی رحمت اور اسکی رضاجوئی پر ہی ہے قرآن حکیم نے ہمیں بتایا، انه لا ییٔس من روح الله الا القوم الکفرون، (خدا تعالیٰ کی رحمت سے وہی مایوس ہوتے ہیں جنھیں خدا پر ایمان اور بھروسہ نہیں) ان مع العسر یسرا، ہر تنگی و پریشانی کے ساتھ آسائش و راحت بھی ضرور ہوتی ہے،

اس عظیم الشان ملک میں جو ہماری طرح اور بھی متعدد مذاہب اور فرقوں کا پیارا وطن ہے "نبی رحمت ﷺ" کے نام لیواؤں اور اس رسول برحق کے امتیون کا جس کی شان میں فرمایا گیا ہے، انك لعلی خلق عظیم، (آپ محاسن اخلاق کا ایک بے مثال نمونہ ہیں) فرض ہیکہ اپنی زندگی میں اخلاق و کردار کی وہ بلندیاں پیدا کریں کہ دنیا انکے وجود کو امن و راحت کا سایہ محسوس کرے انکی وطن دوستی، خیر اندیشی اور اخلاق کریمانہ کو نمونۂ عمل قرار دے اور اس سے سبق حاصل کریں، آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہو، اس پیارے دیش کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوت حق کے علم بردار ہیں جو پورے عالم انسانیت کیلئے امن و رحمت کا پیغام اور ہمدردی و خیرسگالی کا سرچشمہ ہے ایک لمحہ کیلئے بھی اس ملک میں ہماری زندگی

ملک کی وحدت (اکائی) ہے اور جو ملک میں ایک ایسا ترقی پذیر معاشرہ (سوسائٹی) پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں جمہوریت کی فراخ دلی کار فرما ہو اور مذہب و خیال کے اختلافات کے باوجود ملک کے تمام باشندے شہری زندگی میں مساویانہ حقوق سے بہرہ مند ہوں کہ ان کے باہمی تعلقات میں خوشگواری قائم رہ سکے اور پوری خوش دلی کے ساتھ وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی کے لئے کام کر سکیں یقیناً یہی نقطۂ نظر صحیح ہے اور آج جو تکلیف اور شکایت ہے وہ صرف یہ کہ عملی زندگی میں اس نقطۂ نظر سے مسلسل انحراف ہو رہا ہے،

ہمارا موقف و مقام

آج ہم اسلئے جمع ہوئے کہ گذرے ہوئے تیرہ برسوں کی سرگذشت کو سامنے رکھتے ہوئے سوچیں اور غور کریں کہ وطنِ عزیز کی وسعتوں میں سیکولرازم اور جمہوریت کی حقیقی فضاء پیدا کرنے اور دستورِ ہند کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے آخر کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور مسلم اقلیت کے ساتھ ہونے والے غیر دستوری، امتیازی سلوک، ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا مداوا کیونکر ہو اور کون سے وسائل کام میں لائے جائیں کہ ہمیں اس طبقاتی کشمکش، بدامنی بے اطمینانی اور پامالی کی زندگی سے نکل کر دوسرے باشندگان وطن کے ساتھ ساتھ آبرومندانہ اور مساویانہ زندگی میسر آسکے اور موقع مل سکے کہ ذہنی یکسوئی اور دلی اطمینان کیساتھ ہم بھی وطن کی خوشحالی، ترقی و سربلندی کیلئے اپنی بھرپور صلاحیتوں کیساتھ کام کر سکیں

بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں اعتقاد ہے اپنی نیت اور اپنے عزائم پر جو وطن کی خیر خواہی اور خیر سگالی کی راہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں ساتھ ہی ہمیں اعتماد ہے

کسی اجنبی اور تماشائی کی زندگی نہیں ہو سکتی، اسکے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسلئے ملی جلی وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتی میرا تو یقین یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے فرض و منصب کا صحیح احساس بیدار رہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی، ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون، (اللہ کی مدد ہمیشہ انکے ساتھ ہوتی ہے جو کردار و عمل کے کھرے اور نیکوکار ہوں)

(ماخوذ از خطبۂ استقبالیہ انڈین مسلم کنونشن)

مجاہدِ ملت نے ملی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسمیں مصروفِ عمل نہ ہوئے ہوں اردو کے فروغ کی خاطر بڑی بڑی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا، مجاہدِ ملت کو اردو زبان سے گہری دلچسپی تھی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انھوں نے اردو کیلئے جو قربانیاں دیں وہ تاریخ کے صفحات میں زندۂ جاوید رہیں گی،

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تقسیم ہند کے بعد بہت سے طے شدہ مسائل فرقہ پرستی کی نذر ہو گئے تھے ان میں اردو زبان کا مسئلہ سرِ فہرست تھا، اردو زبان کو خود اسکے ملک میں اجنبی قرار دینے کی مخالفین نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی اسکی بیخ کنی کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا زبان کے مسئلے کو لے کر ملک بھر میں فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا دی ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بستیاں نذرِ آتش کر دی گئیں بہت کم افراد تھے جو جذبات کی سطح سے بالاتر ہو کر حقیقت بینی اور دور اندیشی کے ساتھ اس سوال کو طے کرنا چاہتے تھے، گاندھی جی کا نظریہ جو تمام کانگریسی حلقوں میں طے شدہ سمجھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان وہ عام فہم ہندوستانی ہو گی جو پورے شمالی ہند میں رائج اور ملک کے دوسرے حصوں میں متعارف و مشہور ہے، اس کے رسم الخط اردو اور دیوناگری رہیں گے، لیکن تقسیم ہند کے سیلاب میں یہ نظریہ بھی بے معنیٰ ہو کر رہ گیا یہی دور تھا کہ جب ۱۹۴۹ء میں قومی زبان کا سوال کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے سامنے آیا اس وقت مولانا کو

سب سے زیادہ اعتبار کانگریس پارٹی کے ممبران پر تھا مگر بد قسمتی سے کانگریس کی اکثریت بھی اس سوال کو جذبات کے رنگ میں دیکھ رہی تھی

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع تھی دلیل سحر سو خموش ہے

مجاہد ملت کی کہانی انیس الحسن کی زبانی

اس سلسلہ کے ایک اجلاس کی منظر کشی مسٹر انیس الحسن صاحب نے کچھ اس انداز میں کی ہے جس سے مولانا مرحوم کی اردو زبان سے والہانہ عقیدت نیز کانگریسی ممبران کی کج روی پر رنج و ملال اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے چناں چہ وہ خود اپنی آنکھوں دیکھا حال قلم بند کرتے ہیں،

اس بنیادی مسئلہ کے تصفیہ کے لئے جس روز دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا ایک ہنگامی اجلاس کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں ہو رہا تھا، دونوں نقطہائے نظر کی کشمکش اپنی انتہار کو پہنچی ہوئی تھی مولانا مرحوم اور مسٹر رفیع قدوائی مرحوم کے دست راست آنجہانی خورشید لال "ہندوستانی" کی حمایت اور پیروی میں سر گرم عمل تھے مولانا بار بار اجلاس میں جاتے اور آتے اور اپنے ساتھیوں میں سے ایک ایک ممبر کو ڈھونڈ کر لاتے اور بے چین تھے کہ کانگریس پارٹی حقیقت پسندی کے ساتھ قومی زبان کا مسئلہ طے کرلے اور پھر جب جذبات کی رو میں ڈوبی عدد کی اکثریت ہندی کا فیصلہ کرا چکی اور گاندھی جی کی رائے "ہندوستانی" کو ہمیشہ کے لئے نظر انداز کر دیا گیا تو مولانا اپنے گہرے تاثر اور ملال کے ساتھ واپس آئے ان کے دل پر ایک چوٹ تھی

چہرے پر ناکامی سے زیادہ کانگریس کے بنیادی اصولوں کی شکست کا احساس

یکم ستمبر ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی میں بحث جاری تھی ایک طرف کٹر ہندو وادی تھے جو ہندی کو برسر اقتدار لانا چاہتے تھے دوسری جانب مجاہد ملت اور انکے ساتھ چند حقیقت پسند رفقار تھے جو ہندوستان کی عام بول چال جس کو گاندھی جی نے "ہندوستانی" کا نام دیا تھا کو ملک کی قومی زبان بنانا چاہتے تھے ہرچند کہ پلڑا افریقی اول کا بھاری تھا مگر حضرت مجاہد ملت نے قومی زبان کے مسودے پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے۔ جو کچھ کہا وہ انکے داغِ جگر کی ایسی داستان ہے جو عرصۂ دراز تک یاد رکھی جائے گی آپ نے فرمایا،

دل کی آواز

اس کے باوجود کہ ہم ہر موقع پر گاندھی جی کا نام استعمال کرتے ہیں اس مسودے میں گاندھی جی کے طے کردہ اصول کی قطعی خلاف ورزی کی گئی ہے یہ وہ اصول ہیں جنکو گاندھی جی آخری دم تک سمجھتے رہے اور انھیں کا پرچار کرتے رہے یونین کی زبان ہندی ہوگی اور رسم الخط دیوناگری ہوگا یہ نہ صرف گاندھی جی کے اصول کو چیلنج ہے بلکہ کانگریس کی اس تیس سالہ تاریخ کو چیلنج ہے جسمیں کانگریس بار بار یہ یقین دلاتی رہی ہے کہ ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی، آپ نے مزید گفتگو کو طول دیتے ہوئے فرمایا،

۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کے بھیانک حادثہ سے جبکہ گاندھی ہم سے چھین لیے گئے، تین روز قبل دورانِ گفتگو انھوں نے ہم سے کہا تھا کہ اب امن و امان ہوتا جارہا ہے جس طرح تم لوگوں نے قیام امن کے

سلسلے میں میری امداد کی ہے اسی طرح تمہیں ہندوستانی کے پرچار میں بھی ساتھ دینا ہوگا اور ہم نے اس بات کا وعدہ کیا تھا مگر افسوس وہ ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہوگئے، خیال تھا کہ مہاتما جی کے جذبات کا احترام کیا جائے گا لیکن مجھے زبردست حیرانی ہے کہ کل جو لوگ ہندوستانی کا پرچار کر رہے تھے انھوں نے گاندھی جی کے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا اور آج وہ صرف ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دے رہے ہیں حالانکہ گاندھی جی کے نزدیک زبان کا مسئلہ بنیادی مسئلہ تھا، گاندھی جی نے اس زبان کو کبھی ہندی نہیں کہا بلکہ ہمیشہ اسکو ہندوستانی کہا انھوں نے بڑی غور و خوض کے بعد یہ نام پسند کیا تھا،

بہر حال مولانا کی لگاتار کوشش کے بعد اردو زبان کے مسئلہ میں صرف اس قدر کامیابی ہوسکی کہ ملک کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی ہندوستان کی ایک زبان تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ حیثیت صرف دستور کی حد تک تھی جہاں تک عملی دنیا کا تعلق ہے تو اردو کے حق میں ہندوستانی کی فضا برابر تنگ و تاریک رہی ہے بلکہ سرکاری حلقوں میں اردو کے ساتھ معاندانہ سلوک اور قدم بقدم اسکو پامال کرنے کی روش آج تک قائم ہے،

اس وقت میں جبکہ شری ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس نے اردو کو بھارت کلچر کے خلاف قرار دیا تو مولانا نے بڑی شد و مد کیساتھ انکے غلط الزام کی تردید کی اور فرمایا کہ

ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی ہے لیکن اسکے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو جو اسی ملک کی پیداوار ہے

اور ہندو مسلمانوں کے باہمی پریم ساگر کا ایک خوبصورت سنگم ہے اسکو بھی۔
تعلیمی اداروں اور عدالتوں میں سرکاری حیثیت حاصل ہونی چاہیے،

عاشق ریختہ

مولانا کو اردو زبان سے گہری دلچسپی تھی اردو کے
فروغ اور ارتقار کی خاطر مولانا نے ہر ممکن کوشش
کی جب آزادی کے بعد اردو زبان کو اسکے حق واجبی سے محروم کر دیا گیا،
ہر طرف اردو کے خلاف پروپگنڈہ عام تھا ارباب سلطنت سے لے کر
عوام الناس تک ہر ایک اردو کا دشمن تھا ایسے پر آشوب دور میں
مولانا کی ذات ہی ایسی تھی جس کا دل ہمیشہ اردو کی حالتِ زار کو دیکھ کر
روتا، اور اسکی عظمتِ رفتہ پر خون کے آنسو بہاتا،

ع ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں "اردو بحیثیت سرکاری زبان" موضوع
بحث تھا ہر طرف سے اس معصوم و بے گناہ پر کیچڑ اچھالے جارہے تھے
مجمع کے درمیان سے ایک آواز بلند ہوئی "ہندوستان میں فرقہ پرستی کی
تمام تر ذمہ دار اردو زبان ہے" اس جملہ کو سن کر مولانا کا چہرہ غصہ سے
تمتما اٹھا ہر چند کہ مولانا شدید بیمار تھے گلے آنے کے سبب ایک لفظ
بولنا دشوار تھا گلے پر کپڑا بندھا ہوا تھا مگر اس جملہ نے مولانا کو جھنجوڑ
کر رکھ دیا ان کے جذبات ایک پر آشوب دریا کی صورت میں امنڈ پڑے
اور تقریباً ایک گھنٹہ اردو زبان پر ایسی تقریر کی کہ تمام ارکان پارلیمنٹ
کی بولتی بند کر دی، ان کے تمام اشکالات کا جواب مدلل و مفصل دیا
مولانا کی تقریر کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تمام لوگوں کو سانپ سونگھ
گیا ہو اور انکی زبانیں گنگ ہو گئی ہوں مجاہد ملت نے یہ تقریر

۲۹ مارچ ۱۹۶۲ء کو پارلیمنٹ میں پیش کی تھی جسکے چند اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں،

(۱) اسپیکر صاحب آج اس گمراہ کن طرزِ عمل کے خلاف پرزور احتجاج کرنے اور یہ بتانے کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز ٹنڈن جی کا یہ طریق کار ہرگز نہیں دبا سکتا،

(۲) ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح سے اسلئے کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرا اور دوسرے چوٹی کے لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے،

(۳) اردو زبان کی تحریک جو یوپی میں چلائی جارہی ہے اسکی مخالفت کرنے والا خود فرقہ پرست ہے،

(۴) پاکستان اردو نے نہیں بنوایا بلکہ سیاسی بے ایمانوں اور دلوں کے کھوٹ، تنگ نظری اور تنگ دلی نے اس کو چاند لگائے،

(۵) تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہ مسئلہ کانگریس کے اجلاس میں زیرِ بحث تھا اس وقت لیڈروں کی تقریروں کے بعد پہلا شخص میں تھا جس نے پورے زور کے ساتھ کہا کہ بزدلانہ طریقہ پر انگریز کی کرائی ہوئی تقسیم کو قبول نہیں کرنا چاہیئے،

تقریر کے ان چند اقتباسات سے جہاں مولانا کی شجاعت و بہادری اور حق گوئی منتج ہوتی ہے وہیں ملک ملت کا درد بھی واضح ہے،

وطن کے معاملے ہوں یا مسائل دین و مذہب کے
بیاں کرنا ہمیشہ اسکا شیوہ تھا حقیقت کا

الغرض اردو کی تعمیر و ترقی اور اسکے جائز حقوق کیلئے مولانا نے ہر ممکن کوشش کی اس یتیم کے ساتھ جو معاملہ خود اسکے وطن میں کیا جارہا تھا،

اس کے خلاف آواز بلند کی، اپنی تمام تر مشغولیات کے باوجود اردو زبان کیلئے انھوں نے وہ کچھ کیا جو ایک تحریک کا قائد اپنے نصب العین کے لئے کیا کرتا ہے، انکی ایک طرف یہ مانگ تھی کہ دہلی، پنجاب اور یوپی وغیرہ اور شمالی ہند میں اردو کو پورے حقوق حاصل ہونے چاہئیں، اور دوسری طرف یہ کوشش تھی کہ سرکاری دفاتر، تعلیم گاہوں اور جہاں جہاں اردو کے جذبات کو پامال کیا جارہا ہے اس کی روک تھام ہو،

مجاہد ملت نے اردو تحریک کے ان دو پہلوؤں پر جو کام کیا اس کی ایک مختصر رپورٹ جناب انیس الحسن صاحب کی ذاتی ڈائری کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے،

اردو خدمات کا ایک اجمالی خاکہ

(سب سے پہلے ۲۲ ر مئی ۱۹۵۱ء کو انجمن ترقی اردو کا ایک وفد اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی شکایات کا ایک مختصر خاکہ لیکر لکھنؤ میں یوپی کے وزیر تعلیم شری سمپور نانند سے ملا اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مولانا حفظ الرحمن صاحب قاضی عبد الغفار صاحب شریک تھے،

۲۲ ر ۲۳ ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی اردو کے حقوق کی قانونی اور دستوری جدوجہد کے لئے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم کا فیصلہ ہوا حضرت مولانا نہ صرف یہ کہ کانفرنس میں شریک ہوئے بلکہ اسکے اہتمام وانصرام میں بیشتر حصہ مولانا مرحوم ہی کی کوششوں کا تھا،

۲۲،۲۱ مارچ ۱۹۵۲ء کو اجمیر میں کل ہند اردو کانفرنس (قاضی عبد الغفار صاحب مرحوم کی صدارت میں ہوئی) اس کا افتتاح مجاہد ملت نے فرمایا تھا۔ بیس لاکھ دستخطی مہم کو کامیاب بنانے میں جہاں جہاں ضرورت ہوئی مجاہد ملت خود سفر کر کے گئے جلسوں میں شریک ہوئے جمعیۃ علماء کی شاخوں اور کارکنوں کے ذریعہ اس مہم کو کامیاب بنانے میں پوری مدد فرمائی جب مسلسل جد وجہد کے بعد بیس لاکھ دستخط پورے ہو گئے تو ۲۵، ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ ہی میں انجمن ترقی اردو کی دوسری کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں دستخطی مہم کی روداد اور فراہم شدہ دستخطوں کو صدر جمہوریہ ہند کے سامنے لے جانیکا پروگرام زیر غور تھا، اس کانفرنس کے افکار و اعمال میں بھی مولانا مرحوم نے پورا حصہ لیا،

۱۵ ر فروری ۱۹۵۴ء کو نئی دہلی میں انجمن کا معزز وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند سے ملا اور یوپی میں اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کے لئے بیس لاکھ سے زائد انسانوں کے تحریری مطالبہ کا گراں بار ریکارڈ صدر موصوف کو دیا، اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علاوہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت برجموہن شری کشن پرشاد کول، شری متی اوما نہرو، قاضی عبد الغفار، پنڈت سندر لال پروفیسر مسعود حسن رضوی، حیات اللہ انصاری، بیگم حیات اللہ، شری کرشن چندر اور قاضی عزیز احمد شریک تھے،

صدر جمہوریہ سے ملاقات کے دوسرے روز نئی دہلی کے ہوٹل دینگر زمیں وفد کی جانب سے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے مطالبات کی وضاحت اور وفد کی کوششوں کا تذکرہ تھا، کانفرنس میں وفد کی جانب سے بولنے والے حضرات، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت کشن پرشاد کول اور مولانا حفظ الرحمن صاحب تھے،

۲۹ر مارچ ۱۹۵۶ء کو جے پور میں کل راجستھان اردو کنونشن میں اور پھر ۴ر ۵ر جولائی ۱۹۵۶ء علی گڑھ میں منعقدہ اردو کانفرنس میں حضرت مولانا نے شرکت فرمائی،

۱۴ر اگست ۵۶ء کو جے پور پہنچ کر راجستھان کے وزیر اعلے وزیر تعلیم ڈائریکٹر تعلیمات سے ملاقات کی اور راجستھان کے اسکولوں میں اردو کو نظر انداز کیے جانے کی شکایات ان کے سامنے رکھیں ملاقات میں سید الطاف احمد خیری صاحب صدر راجستھان اردو کانفرنس اور مولوی احترام الدین شاغل سکریٹری بھی مولانا مرحوم کیساتھ تھے،

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر تاراچند کی صدارت میں منعقد ہوئی جسکا افتتاح وزیر اعظم مسٹر نہرو نے کیا اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی زندگی کی آخری تقریر یہیں ارشاد فرمائی کانفرنس کے اہتمام و انصرام کے ذمہ دار اعلیٰ اور صدر مجلس استقبالیہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی تھے اور بحیثیت صدر استقبالیہ حضرت مولانا مرحوم نے جو خطبہ اس کانفرنس میں پڑھا تھا وہ بلا مبالغہ اردو تحریک کی ایک اہم تاریخ کہا جاسکتا ہے، کانفرنس کے بعد ۲۹ر اپریل ۵۸ء کو نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کا وفد دوسری بار صدر جمہوریہ ہند سے ملا

اس میں بھی دوسرے عمائدین تحریک کے ساتھ حضرت مولانا پیش پیش تھے اردو کے سلسلے میں مجاہد ملت کی مسلسل کاوش اور دلسوزی کا آخری نقش وہ مکتوب ہے جو انھوں نے اپنے مرض الموت کے دوران جبکہ میڈیسن (امریکہ) میں زیر علاج تھے بستر علالت سے یوپی کے چیف منسٹر شری سی، بی گپتا کو لکھا اور اسکی نقل وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھیجی جس میں یوپی کے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو نظرانداز کرنے پر پرزور احتجاج کے ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا کہ مجوزہ فارمولے میں جس طرح جنوبی ہند تک کی زبانوں کیلئے گنجائش رکھی گئی غریب اردو کے لئے بھی کچھ رحم دلی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا جائے،

وزیر اعظم پنڈت نہرو نے حضرت مولانا کو اپنا جواب امریکہ بھیجتے ہوئے انکی رائے سے پورا اتفاق کیا اور لکھا کہ میں چیف منسٹر یوپی کو بھی ساتھ ہی خط لکھ رہا ہوں،

مولانا کو مسلم یونیورسٹی سے والہانہ عقیدت

گذشتہ یک صدی کی عظیم الشان علمی وراثت، ہندوستان کی مشہور مسلم درسگاہ یعنی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، تقاسمہ کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات کے رنگ میں رنگ کر اسکا ماحول، اس کی روایات اور سیاسی رجحانات بے معنے ہو کر رہ گئے تھے ۱۵ راگست ۴۷ء کی صبح اس بیش بہا علمی روایت کیلئے کڑی آزمائش کا پیغام لے کر نمودار ہوئی مولانا ابو الکلام آزاد اور مجاہدِ ملت ہی ایسے اولوالعزم رہبر تھے جنھوں نے اس مسلم یونیورسٹی کی ڈوبتی نیا کو ساحل تک پہونچایا اور ہر نازک موڑ پر خبرگیری و دستگیری فرما کر اسکے عزت و وقار کو پامال ہونے سے محفوظ رکھا

چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا سربراہ بناکر بھیجا ادھر ۱۹۴۸ء کے شروع سے ہی مولانا حفظ الرحمن صاحب نے بھی اسکے معاملات سے دلچسپی لینا شروع کردی تھی اور ہر برے وقت میں اسکی خدمت کا بیڑہ اٹھایا یونیورسٹی کے ذمہ داران نے بھی آپکے تعاون و قیمتی مشوروں کو اپناکر خوب استفادہ کیا، واقعہ یہ ہے کہ ملک کے کوتاہ نظر حلقے ۴۷ء سے مسلسل مسلم یونیورسٹی کا نام و نشان مٹانے کے درپے رہے ہیں خود حکومت یوپی کا (جس کے حدود میں مسلم یونیورسٹی واقع ہے) سلوک اسکے ساتھ کوئی خاص ہمدردانہ و دوستانہ نہیں رہا ہے، مسلم یونیورسٹی کا نام بدلنے کے سلسلے میں بارہا بحث و مباحثہ ہوتے ہیں،

۵۹ء و ۶۰ء میں ہند پارلیمنٹ تک میں اسکے خلاف پروپیگنڈہ ہوا اس موقع پر مجاہد ملت ہی کی ذات ایسی تھی جو اسکے خلاف سر اٹھانے والوں کی سرکوبی کیلئے سینہ سپر ہو گئی موصوف نے پارلیمنٹ میں اٹھائے گئے تمام الزامات اور نکتہ چینیوں کا ایسا جواب دیا کہ مخالفین کے دانت کھٹے کر ڈالے ساتھ ہی مرکزی وزارت تعلیم کی نظر میں مسلم یونیورسٹی کے دامن کو شکوک و شبہات سے صاف کرنے کے لئے پوری جدوجہد فرمائی مولانا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کے ممبر تھے اور بہت کم ایسا ہوتا کہ موصوف اسکے جلسوں میں شریک نہ ہوئے ہوں،

الغرض مسلم یونیورسٹی کے خلاف معاندین کی ان تمام کوششوں کی روک تھام کیلئے جو صف آرائیاں عمل میں آتی رہیں مولانا ان سب میں پیش پیش رہے ہے اور بٹوارے کے بعد مسلم یونیورسٹی کو جو بقا و استحکام نصیب ہوا اسکے بارے میں زبان بے اختیار کہہ اٹھتی ہے کہ ان تما سرگرمیوں کا

محور امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد، وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی رہے ہیں،

مولانا کو دار العلوم سے عقیدت

مولانا کی نظر و فکر میں پختگی پیدا کرنے میں دار العلوم دیوبند کا بنیادی حصہ ہے خود اسکا احساس مولانا کو بھی تھا یہی وجہ ہے کہ انکو دار العلوم اور اس کے طلبا سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی آپ ہمیشہ یہاں کے طلبہ کی تکالیف کو دور کرنے کیلئے تیار رہتے ہر طالب علم آپ سے بلا تکلف ملتا اور حالِ دل سناتا آپ اس کی روداد عذر غور سے سماعت فرماتے پھر اسکی تکلیف کے دور کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ فرماتے، مختلف کاموں کیلئے لڑکے آپ سے شفارشیں لکھواتے اس قدر عالی مرتبت ہونے کے باوجود انا پسندی کے بہت سخت مخالف تھے ہر کس و ناکس کے درد کو سنکر آپ بے چین ہو اٹھتے، اور کیوں نہ بیقرار ہوتے ــــــ جبکہ

ے
درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی جنھوں نے مولانا کو کافی قریب سے دیکھا ہے، آپ کے مادر علمی سے والہانہ تعلق کے سلسلے میں فرماتے ہیں دار العلوم کے مدرسین و ملازمین سے خاکسار (مفتی صاحب) نے متعدد واقعات ایسے سنے ہیں کہ اگر کسی ملازم یا کسی مدرس کو کوئی الجھن پیش آتی یا باہمی نزاع کی وجہ سے کوئی کسی کو گرانا چاہتا تو سیدھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا اپنی شکایت رکھتا مولانا سنجیدگی سے سنتے

اور پھر خاموشی کے ساتھ اسکی الجھن کو دور کرنے کی حتی الامکان جدوجہد کرتے اور باہمی کشمکش سے نکال کر مضبوط راہ پر گامزن کر دیتے، کسی کا تقرر ہوتا، یا کسی کا استقلال، کسی کی ترقی کا مسئلہ ہوتا یا کوئی اور بات، مولانا ہر موقع پر کھڑے ہو جاتے، بیسوں کی ترقی و استقلال میں آپ نے مدد پہنچائی اور اسطرح ان کو سہارا دیا، اپنا یقین ہے کہ مولانا نے کبھی کسی کو اپنی ذات سے معمولی نقصان بھی نہیں پہنچایا ہوگا،

مولانا ایک سیدھے اور نیک طبیعت مسلمان تھے بغض، کینہ، حسد وغیرہ کا ان کے پاس سے گذر بھی نہ ہوتا تھا، وہ ہمیشہ دوسروں کی خاطر مٹنے کیلئے تیار رہتے اگر کسی کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ حرکت صادر ہو جاتی تو آپ اسکو خندہ پیشانی سے نظر انداز کر دیتے مولانا دلوں کو جوڑنا جانتے تھے دلوں کا توڑنا انکی زندگی میں جرم عظیم تھا، دارالعلوم سے آپ کا گہرا تعلق ایک تو اسلئے تھا کہ آپ اسی کے مایہ ناز فرزند تھے اور دوسرے اسلئے کہ یہ ہماری علمی روایت کا مخزن ہے، آپ کو قریب سے دیکھنے اور برتنے والوں کی ابھی کمی نہیں ہے مگر کبھی کسی سے آپ کے متعلق یہ سننے میں نہیں آیا کہ مولانا نے اس کے ساتھ بے مروتی کا معاملہ کیا ہو اس کی ضرورتوں میں کام نہ آئے ہوں یا پس وپیش الگ الگ رنگ میں ظاہر ہوتے ہوں، مولانا کا ظاہر و باطن یکساں تھا جو دل میں ہوتا وہی زبان پر آتا جو سامنے کہتے وہی پیچھے کہتے حدیث میں مسلمان کی یہ تعریف مولانا پر بالکل صادق آتی ہے،

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ

مسافرانِ حرم کے سلسلے میں مولانا کی مساعیٔ جمیلہ

مولانا کی زندگی میں خدمت کا وصف ایسا نمایاں اور چمکدار ہے جو چاندی کے اوراق پر سونے کے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے جہاں موصوف ۱۹۴۷ء اور اسکے بعد فتنہ وفساد کے میدان میں تنہا جولانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں دیگر خدمات میں بھی انفرادیت کا درجہ رکھتے ہیں اس مردِ مومن اور مردِ کامل کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا،

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مولانا نے اپنی دوسری گراں بار مصروفیتوں کے باوجود مسافران حرم کی جو خدمت کی وہ اظہر من الشمس ہے خاص طور سے سینٹرل حج کمیٹی کی اسی کا نتیجہ تھا کہ موصوف ۱۹۵۹ء سے لیکر تا دم آخر سینٹرل حج کمیٹی کے رکنِ رکین رہے آخری وقت میں اس کے چیرمین بھی موصوف ہی تھے،
تمام مشغولیات کے باوجود حج کے موقع پر بمبئی کا ایک سفر ضرور کرتے اور حجاج کے لئے جہازوں کی ضروریات و دیگر سہولیات فراہم کراتے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان سے باہر جانے والوں پر انکم ٹیکس کلیرنس سارٹیفکٹ کی پابندی لگادی گئی جسکی عملی دشواری حجاج کرام کو ہوئی مولانا نے

سکریٹری سینٹرل حج کمیٹی کو ایک خط تحریر کیا جس میں حجاج کو اس پابندی سے مستثنیٰ کئے جانے کے بارے میں لکھا تھا مگر وزارتِ مالیات اس پر آمادہ نہ ہو سکی ۲۹ رمئی کو مولانا مرحوم عید الفطر کے دن وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو سے ملے اور حجاج کی ان دشواریوں پر توجہ دلائی دوسرے ہی دن محترم پنڈت نہرو نے متعلقہ وزارتوں کو یہ ہدایت جاری کردی کہ مسافران حرم کو اس پابندی سے مستثنیٰ رکھا جائے،

۱۹۵۵ء میں عازمین حج کی تعداد معمول سے بہت زیادہ تھی تمام سیٹیں پُر ہونے کے بعد ایک بڑی تعداد رہ گئی تھی جسکی بنا پر بہت سے چہرے مرجھا ہوئے تھے مولانا سے یہ دیکھا نہ گیا اور اسی وقت ٹرنک کال پر وزارتِ داخلہ سے گفتگو کر کے ہر جہاز میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا چناں چہ ہر طیارہ میں معمول سے دس فیصدی کا اضافہ کر دیا گیا اس طرح سے ان عازمین کی ایک کثیر تعداد حرمین کی زیارت سے بہرہ مند ہو سکی جو مایوس ہو کر لوٹنے کا عزم کر رہے تھے،

۱۹۵۶ء میں مولانا حج و زیارت کے لئے خود تشریف لے گئے، پیشِ نظر رہے کہ مولانا کا یہ دوسرا سفر تھا اس سے پہلے قیام ڈابھیل کے زمانے میں اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے تھے جیسا کہ ماقبل میں ذکر آچکا ہے،

اک شمع رہ گئی تھی۔۔۔

جبل پور، ساگر وغیرہ کے جاں گسل حوادث سے مجاہد ملت کو جو قلبی وذہنی اذیت پہونچی اور اصلاح حال کیلئے تدابیر کا جو بوجھ پڑا اس نے موصوف کے بڑھاپے کی صحت اور توانائیوں کو بے حد مضمحل کر دیا تھا رمضان کا مہینہ تھا اور وہ اپنے معمول کے مطابق سال کے گیارہ ماہ ملک وملت کیلئے وقف رکھتے تھے مگر رمضان میں دہلی سے باہر نکلنا پسند نہ کرتے تھے لیکن حالات کی سنگینی نے اخیر عمر میں جبکہ آرام کی سخت ضرورت تھی اس معمول پر بھی برقرار نہ رہنے دیا اور رمضان ہی میں جبل پور ساگر وغیرہ کا دورہ کیا، مسلم کنونشن کی تیاریوں کا عظیم بوجھ بھی مولانا ہی پر پڑا آخر کار مولانا کی صحت رفتہ رفتہ بگڑتی چلی گئی اور مرض پوری قوت کیساتھ انکی صحت پر قابض ہو گیا ۲۳ر جنوری ۱۹۶۲ء کی تاریخ تھی کہ مولانا زندگی بھر کی تھکن اور مرض جانکاہ کو ساتھ لیکر بستر علالت پر ایسے گرے کہ آخر کار اللہ کی رحمتوں نے انھیں بستر علالت سے نہیں دنیا ہی سے اٹھالیا

علاج کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنے پرانے معالج ڈاکٹر پانڈے سے رجوع فرمایا انھوں نے پھیپھڑوں سے جو پانی نکالا اس میں خون کی گہری آمیزش دیکھ کر کینسر کا خدشہ ظاہر کیا مزید تحقیق کیلئے خون ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں بھی کینسر کے جراثیم پائے گئے

ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی بمبئی لے جانے کی ہدایت کی چنانچہ ۲۶ ر جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے بمبئی لے جایا گیا گورنر بمبئی شری سری پر کاشں جو مولانا کے مخلص دوستوں میں سے تھے انھوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹاٹا ہوسپٹل میں بھرتی کرایا، ایک مہینہ تک وہاں علاج ہوتا رہا بعد ازاں ۲۶ ر فروری ۱۹۶۲ء کو دہلی واپس آئے اور یہاں حاذق طبیبوں اور ماہر ڈاکٹروں سے رجوع رہا مگر ـــــــــ

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علاج کی آخری کوششوں کیلئے یہ طے ہوا کہ مولانا کو امریکا لے جایا جائے چنانچہ ۱۶ر اپریل ۱۹۶۲ء کو شام آٹھ بجے عالمی ایروڈروم "پالم" سے امریکہ کیلئے روانہ ہوئے (رفیق سفر مولانا کے داماد مسٹر عزیز الرحمن صاحب تھے) امریکہ کی ریاست وسکونسن) کے مشہور شہر (میڈیسن) میں ڈھائی ماہ زیر علاج رہنے کے بعد ۱۲ر جولائی کو صبح سویرے دہلی واپس پہنچے حالت بہت گر چکی تھی دہلی کی گرمی شباب پر تھی اسلئے مولانا گلمرگ (کشمیر) جانے کا عزم کر رہے تھے تیاری بھی مکمل ہو چکی تھی مگر قضائے الٰہی انکے لئے گلمرگ کی بجائے گلزار بہشت میں ابدی و سرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی تھی مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کی صحت و شفا کیلئے پورے ملک میں دعائیں ہو رہی تھیں مگر مشیتِ ایزدی کو ان سے جو کام لینا تھا وہ مکمل ہو چکا تھا،

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

بالآخر مجاہد ملت کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی وقت اور تاریخ کے

طوفانوں سے کھیلنے والی زندگی ۶۲ء میں پوری ہوگئی،

ے دل کو سکوں روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

۱۲/ اگست ۶۲ء مطابق یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو صبح ۳½ بجے بارگاہِ ربی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں گلستاں نما خزاں آباد کی باسٹھ بہاریں دیکھ کر اس عالم آب و گل کو الوداع کہا

ے کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

شام ۴½ بجے دو لاکھ انسانوں کے بے حال و اشکبار مجمع نے سفر خلد بریں کیلئے دولہا بنا کر اپنے شانوں پر اٹھایا، دہلی دروازے کے بیرونی میدان میں حکیم الاسلام جناب حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم (دیوبند) نے نماز جنازہ پڑھائی اور شام کے سہانے وقت میں ملک و ملت کا یہ سرمایہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والدِ بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب کے سرہانے سپردِ خاک کر دیا گیا اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اولیاء اللہ آغوش پھیلائے ہوئے منتظر تھے،

ے سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ